انتخاب نثر اردو

قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی

انتخاب نثر اردو

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک 1 آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066

Intekhab-e-Nasr-e-Urdu

پہلی اشاعت : 2008

تیسری طباعت : اگست 2009

تعداد : 1100

قیمت : -/48روپے

سلسلہ مطبوعات : 1307

ISBN: 978-81-7587-259-2

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066

فون نمبر:26103938، 26103381، 26179657، فیکس:26108159

ای۔میل:www.urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in

طابع: جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد دہلی۔006 110

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

انتخاب نثر اردو

Intekhab-e-Nasr-e-Urdu

پہلی اشاعت : 2008

تیسری طباعت : اگست 2009

تعداد : 1100

قیمت : -/48روپے

سلسلہ مطبوعات : 1307

ISBN: 978-81-7587-259-2

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159

ای۔میل: www.urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد دہلی۔110 006

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

انتخاب نثر اردو

پیش لفظ

اردو ہندوستان کی ان زبانوں میں ہے جس کے سمجھنے اور بولنے والے ہندوستان سے باہر بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں اور اس میں لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں مقیم ہیں۔ اس طرح اردو اب ایک عالمی زبان کی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔

ہندوستانی ادب، ثقافت اور تہذیب کو اردو کی جو دین ہے، اس سے سب واقف ہیں۔ مختلف العقیدہ اور مختلف الخیال لوگوں کے درمیان ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے اور انھیں ایک دوسرے کے قریب لانے میں بھی اردو نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ آج ہم قومی یک جہتی کے جس تصور کو فروغ دینے کے لیے کوشاں ہیں، اردو اپنی ابتدا ہی سے اس کی آبیاری کرتی رہی ہے۔ یک جہتی کا یہ تصور قومی زندگی کے لیے کتنا اہم اور کتنا ضروری ہے، اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

ہندوستان پر انگریزوں کے غاصبانہ تسلط کے فوراً بعد ہی سے اس تسلط کے خلاف جو فضا تیار ہونا شروع ہوگئی تھی، اس میں بھی اردو نے ناقابلِ فراموش حصّہ لیا اور اہل وطن کے دلوں کو اس کے شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں نے حبِ وطن کے جذبات سے گرما دیا۔ آج بھی یہ زبان ان فرائض کو ادا کر رہی ہے جو ملک وقوم کی طرف سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔

اسے ملک کی بے توفیقی ہی کہا جائے گا کہ آزادی کے بعد اردو کو کچھ سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا اور سیاسی مفاد پرستوں نے ملکی آبادی کے ایک بڑے حصے کو اس کی طرف سے بدظن اور بدگمان کر دیا۔ مگر اب یہ بدظنی اور بدگمانی دور ہو رہی ہے اور ان غلط فہمیوں کی دبیز دھند چھٹ رہی ہے جن میں یہ ہر دلعزیز زبان گھر گئی تھی۔

موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ ہزاروں لوگ جنھیں اردو پڑھنے کا موقع نہیں ملا اب اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے انھی لوگوں کی خواہش کے احترام میں قومی اردو کونسل نے اردو کا مراسلاتی کورس شروع کیا ہے جو بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔

یہ کتاب جو اردو کے نامور محقق اور ناقد جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے تیار کی ہے اور اردو نثر کے انتخاب پر مشتمل ہے، اردو مراسلاتی کورس کے انھی شرکا کے لیے ہے۔ محترم فاروقی صاحب نے اس کتاب کی تیاری پر جو محنت صرف کی ہے اور جس دقتِ نظر کے ساتھ اسے مرتب کیا ہے، اس کا اندازہ کتاب پر ایک سرسری نظر ڈال کر بھی ہو جاتا ہے۔ فاروقی صاحب نے یہ کام بلا معاوضہ انجام دیا ہے، ہم تہہِ دل سے ان کے شکر گزار ہیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

ترتیب

1	اقبال کے بارے میں ایک خط	مہاتما گاندھی	9
2	صبح آزادی پر تقریر	پنڈت جواہر لال نہرو	13
3	عقاب اور مکڑی (روسی کہانی)	ترجمہ: پروفیسر محمد مجیب	16
4	شیر اور برہمن کا قصہ	نہال چند لاہوری	20
5	ایلورا کے مندر	ترجمہ: سید علی بلگرامی	26
6	1880 میں ریل کا سفر	الطاف حسین حالی	32
7	کچھ پرانے شاعروں کے حالات	مولانا محمد حسین آزاد	39
8	شریمد بھگوت گیتا (اقتباس از باب)	ترجمہ: اچے مالوی	45
9	میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں	پریم چند	48
10	عصمت آپا: ایک شام کی گفتگو	شکیلہ رفیق	54
11	قرۃ العین حیدر کے اقوال	قرۃ العین حیدر	59
12	مجھے میرے بزرگوں سے بچاؤ	کنہیا لال کپور	64
13	اردو زبان کے بارے میں کچھ ضروری باتیں	الطاف حسین حالی	69
14	اردو ادب وسط انیسویں صدی تک	سید احتشام حسین	74
15	اچھی چیز سے نقصان نہیں	ترجمہ: ڈاکٹر ذاکر حسین	87

16	چکبست لکھنوی	آل احمد سرور	94
17	میر باقر علی	شاہد احمد دہلوی	100
18	عمر بن عبدالعزیزؒ کی کچھ خصوصیات	شبلی نعمانی	107
19	کاہلی	سر سید احمد خاں	113
20	انگریز افسر سے ملاقات	نذیر احمد	119
21	کامیابی کا قرآنی راستہ	مولانا ابوالکلام آزاد	130
22	ارتقا کا نظریہ اور مسلمان فلاسفہ	شبلی نعمانی	139
23	دیا سلائی	خواجہ حسن نظامی	146
24	چندرو کی دنیا	کرشن چندر	154
25	بادل	انتظار حسین	174
26	بھولا	راجندر سنگھ بیدی	182
27	خطوط غالب	میرزا اسداللہ خان غالب	199
28	لوتھ	محمد حمید شاہد	210

❀❀

اقبال کے بارے میں ایک خط

مہاتما گاندھی

SEGAON, WARDHA
مورخہ ۹ جون ۱۹۳۸ء

بھائی محمد حسین -
آپ کا خط ملا - ڈاکٹر اقبال مرحوم
کے بارے میں میں کیا لکھوں؟
لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب
انکی مشہور نظم "ہندوستاں ہمارا"
پڑھی تو میرا دل بھر آیا - اور
یروڈہ جیل میں تو سینکڑوں بار
میں نے اس نظم کو گایا ہوگا - اس نظم
کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ
خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے
کانوں میں گونج رہی ہے

آپکا
مو. ک. گاندھی

مورخہ 9/جون 1938ء

بھائی محمد حسین۔

آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بارے میں میں کیا لکھوں؟ لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم "ہندوستان ہمارا" پڑھی تو میرا دل ابھر آیا۔ اور یاروِدہ جیل میں تو سینکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

آپ کا

(دستخط) مو۔ک۔گاندھی

❀❀

نوٹ: مندرجہ بالا خط مہاتما گاندھی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس خط کی ہو بہو نقل شائع کی گئی ہے۔ ہمیں اصل خط کی نقل جناب پروفیسر عبدالستار دلوی سے دستیاب ہوئی ہے۔ ہم ان کے شکر گذار ہیں۔

غور کرنے کی بات

چودھری محمد حسین لاہور کے مشہور لوگوں اور علامہ اقبال کے دوستوں میں تھے۔ انھوں نے اقبال کے انتقال (اپریل 1938) کے بعد اقبال کے بارے میں ایک جلسہ کرنا چاہا تو مہاتما جی (1869 تا 1948) کو بھی لکھا کہ وہ اقبال کے بارے میں اپنا پیغام بھیجیں تا کہ اس جلسے میں پڑھ کر سنایا جا سکے۔ مہاتما گاندھی کا یہ خط چودھری محمد حسین کے خط کے جواب میں ہے۔

مہاتما جی نے ہر جگہ "نون غنہ" میں ن کا نقطہ لگایا ہے۔ پہلے زمانے میں لوگ ایسا کرتے تھے۔ اب یہ رائج نہیں ہے۔ اسی طرح انھوں نے "بھائی" اور "بھی" میں دو چشمی "ھ" کے بجائے وہ "ہ" استعمال کی ہے جسے "لٹکنیا" کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ بھی اب رائج نہیں ہے۔

مہاتما جی نے "کہہ سکتا"، "کانوں میں"، "میں نے" اور "آپ کا" الفاظ کو ملا کر لکھا

ہے۔ یہ طریقہ پرانے زمانے میں، خاص کر گجرات اور مہاراشٹر میں رائج تھا، اب نہیں ہے۔ ''مینے'' تو اب بالکل نہیں لکھا جاتا۔

اسی طرح، ''ان کی'' اور ''ان کے'' وغیرہ کو اب ملا کر بہت کم لکھا جاتا ہے۔ ہاتھ سے لکھنے میں تو ایک حد تک ٹھیک ہے لیکن چھاپنے کے لیے ٹھیک نہیں ہے، کیوں کہ چھپی ہوئی شکل میں دیکھ کر لوگ اسی کو رائج اور صحیح سمجھ لیں گے۔

مہاتما جی نے ''دل ابھر آیا'' لکھا ہے۔ اصل محاورہ ''دل بھر آنا'' ہے۔

مہاتما جی نے 9 رجون 1938ء لکھ کر 1938 کے بعد ء کا نشان لگایا ہے۔ یہ ''عیسوی'' کی علامت ہے اور یہ علامت اس زمانے میں کم رائج ہے۔ اب اگر عام سنہ (یعنی جسے عیسوی سنہ کہتے ہیں) لکھنا ہو تو صرف سال لکھنا کافی ہے، جیسے 2007، اور اگر ہجری سنہ لکھنا مطلوب ہو تو اس کے آگے ''ھ'' یا ''ہج'' کی علامت بنا دیتے ہیں، جیسے 1428ھ یا 1428ہج۔ اگر یہ بات واضح کرنی ہو کہ عیسوی سنہ مراد نہیں ہے تو سال کے آگے ''حالی'' لکھا جا سکتا ہے۔ اور اگر وہ سنہ دکھانا مقصود ہو جسے پہلے زمانے میں ''قبل مسیح'' [ق-م-] کہتے تھے، تو اسے ''قبل حالی'' کہہ کر ظاہر کر سکتے ہیں۔ انگریزی میں جو اصطلاحیں پہلے رائج تھیں، .A. D اور .B. C، وہ عیسائی مذہب کے اعتبار سے تھیں۔ .A. D کا مفہوم تھا Anno Domini یعنی In the Year of Our Lord، اور .B. C کا مطلب تھا Before Christ۔ اب تمام لوگوں کا کہنا ہے کہ دنیا میں صرف عیسائی ہی نہیں، اور بھی بہت سے مذہبوں کے ماننے والے بستے ہیں، اور چونکہ اب سبھی ان سنوں کو مانتے ہیں، لہٰذا انھیں In the Year of Our Lord اور Before Christ کہنے پر کیوں مجبور کیا جائے؟ لہٰذا اب تمام دنیا میں .A. D کی جگہ .C. E یعنی Common Era اور .B. C کی جگہ .B. C. E یعنی Before the Common Era لکھا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم لوگوں کو بھی چاہیے کہ ''عیسوی'' اور ''قبل مسیح'' کی جگہ ''حالی'' اور ''قبل حالی'' لکھیں، اور تاریخ درج کرتے وقت اس کے آگے ''عیسوی'' کی علامت ''ء'' نہ بنائیں۔

گنتی خاص کر وقت یا تاریخ کے بعد ر کا نشان لگانا پہلے زمانے میں بہت عام تھا اور اب بھی جگہ جگہ رائج ہے۔ یعنی ''۹ جون'' کی جگہ ''۹ رجون'' لکھنا، یا ''۴ بجے صبح'' کے بجائے ''۴ر

بجے صبح'' لکھنا۔

مہاتما گاندھی نے ''سینکڑوں'' لکھا ہے یہ املا اب بھی رائج ہے، لیکن بعض لوگ ''سیکڑوں'' لکھتے ہیں۔ وہ بھی درست ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ ''سیکڑہ'' بمعنی ''سو'' (100) میں نون نہیں ہے۔ یعنی ''سینکڑہ'' لکھنا ٹھیک نہیں۔

علامہ اقبال کی جس نظم کا ذکر مہاتما گاندھی نے کیا ہے اس کا پہلا شعر ہے ۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

صبح آزادی پر تقریر

پنڈت جواہر لال نہرو

ہمارا ملک آزاد ہوا، سیاسی طور پر ایک بوجھ، جو بیرونی حکومت کا تھا، وہ ہٹا۔ لیکن آزادی بھی عجیب عجیب ذمہ داریاں لاتی ہے، اور بوجھ ڈالتی ہے۔ جب ان ذمہ داریوں کا سامنا ہمیں کرنا ہے اور ایک آزاد حیثیت سے ہمیں بڑھنا ہے اور اپنے بڑے بڑے سوالوں کو حل کرنا ہے۔ سوال بہت بڑے ہیں۔ سوال سارے عوام کی بہبود کے ہیں۔ ہمیں غریبی دور کرنا ہے، بیماری دور کرنا ہے، جہالت کو دور کرنا ہے، اور آپ جانتے ہیں کتنی مصیبتیں ہیں، جن کو ہمیں دور کرنا ہے۔ آزادی محض ایک سیاسی چیز نہیں ہے۔ آزادی تبھی صحیح معنوں میں آزادی ہوسکتی ہے جب اس سے جنتا کو کوئی فائدہ ہو۔ آج کل ہمارے سامنے بہت سے معاشی اور اقتصادی سوال جمع ہو رہے ہیں، جو ہمارے غلامی کے زمانے کے ہیں، بہت کچھ پچھلی لڑائی کی وجہ سے، پچھلی بڑی لڑائی جو دنیا میں ہوئی اور اس کے بعد جو حالات دنیا میں ہوئے ہیں، ان کی وجہ سے یہ سوال جمع ہیں۔ کھانے کی کمی ہے، کپڑے کی کمی ہے، اور ضروری چیزوں کی کمی ہے اور اوپر سے چیزوں کے دام بڑھتے جاتے ہیں، جس سے عوام کی مصیبتیں بڑھ رہی ہیں۔

ہم ان سب باتوں کو کوئی جادو سے تو دور نہیں کر سکتے، لیکن پھر بھی ہمارا فرض

ہے کہ ان سوالوں کو طے کر کے عوام کو آرام پہنچائیں اور پورے طور سے ان سوالوں کو حل کرنے کی بھی کوشش کریں، لیکن اس سے پہلے ایک سوال اور ہے۔ اور وہ یہ کہ ہمارے سارے ملک میں امن ہو، شانتی ہو، آپس کے جھگڑے بالکل بند ہوں، کیوں کہ جب تک لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں تب تک کوئی کام معقول طریقے سے نہیں ہوسکتا۔ تو آپ سے میری پہلی درخواست یہ ہے کہ آج جو ہماری نئی گورنمنٹ بنی ہے، اس نے بھی آج یہ پہلی درخواست ہندوستان سے کی ہے، جو آپ کل شاید صبح کے اخباروں میں پڑھیں، وہ یہ کہ آپس کی جو نااتفاقی اور جھگڑے ہوتے ہیں، یہ فوراً بند کیے جائیں، کیوں کہ آخر اگر نااتفاقی ہے تو وہ بھی ان جھگڑوں اور مار پیٹ سے کس طرح حل ہوگی؟ آپ نے دیکھ لیا کہ ایک جگہ جھگڑا ہوتا ہے، دوسری جگہ اس کا بدلہ لیا جاتا ہے۔ اس کا کوئی خاتمہ نہیں، اور یہ باتیں آزاد لوگوں کو کچھ زیب نہیں دیتیں۔ یہ غلامی کی باتیں ہیں۔ ❋❋

غور کرنے کی بات

ہندوستان کے وزیر اعظم اور عظیم قومی رہنما پنڈت جواہر لال نہرو (1889 تا 1964) کی یہ اردو تقریر، جس کا اقتباس ہم نے اوپر پیش کیا ہے، انگریزی یا کسی اور زبان سے ترجمہ نہیں ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ نہرو جی کی مادری زبان اردو تھی۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ نہرو جی کو انگریزی تحریر و تقریر پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ نہرو جی کی کوئی اردو تحریر ہم تک نہیں پہنچی ہے لیکن پندرہ اگست کے موقع پر 1947 سے لے کر 1963 تک جو باتیں اپنی تقریروں میں عوام کے سامنے انھوں نے رکھیں، انھیں حکومت ہند نے شائع کر دیا ہے۔ ہم ان کی پہلی تقریر مورخہ پندرہ اگست 1947 کا اقتباس پیش کر رہے ہیں، جس میں ایک لفظ بھی بڑھایا یا گھٹایا نہیں گیا ہے۔

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ پنڈت نہرو کی اردو کتنی سلیس اور شستہ ہے اور انھوں نے مشکل

باتوں کو بھی ہمارے سامنے آسان کر کے رکھ دیا ہے۔

نہرو جی نے اپنی پہلی ہی تقریر میں فرمایا ہے کہ ''ایک جگہ جھگڑا ہوتا ہے، دوسری جگہ اس کا بدلہ لیا جاتا ہے۔ اس کا کوئی خاتمہ نہیں اور یہ باتیں آزاد لوگوں کو زیب نہیں دیتیں۔ یہ باتیں غلامی کی باتیں ہیں۔'' نہرو مرحوم کا یہ قول آج بھی اتنا ہی سچا ہے۔ کاش ہم اس پر عمل کر سکیں۔

اس تقریر میں ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ پنڈت نہرو نے قومی اور بین الاقوامی دونوں طرح کے مسائل کا ذکر کیا لیکن ان کی زبان پھر بھی بہت سادہ اور رواں ہے۔ انھوں نے بعض باتیں دہرائی ہیں، لیکن تقریر میں ایسا اکثر ہوتا ہے۔

فرہنگ

معاشی =	Things which relate to income, means of income, to earn money and to live	वे वस्तुएं जिनका सम्बन्ध आय, आय के साधनों, जीविकोपार्जन और जीवित रहने से है।
اقتصادی =	Related to wealth, income, expenditure and production	पूंजी, आय, व्यय और उत्पादन से सम्बन्धित
بہبود =	Welfare	भलाई, कल्याण

عقاب اور مکڑی

(روسی کہانی)

ترجمہ: پروفیسر محمد مجیب

ایک عقاب بادلوں کی چادروں کو چیرتا ہوا کوہ قاف کی چوٹیوں پر پہنچا اور ان پر چکر لگا کر ایک صدیوں پرانے دیودار کے درخت پر بیٹھ گیا۔ وہاں سے جو منظر دکھائی دے رہا تھا اس کی خوبصورتی میں وہ محو ہو گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا ایک سرے سے دوسرے سرے تک تصویر کی طرح سامنے کھلی ہوئی رکھی ہے۔ کہیں پر دریا میدانوں میں چکر لگاتے ہوئے بہ رہے ہیں، کہیں پر جھیلیں اور کہیں پر درختوں کے کنج پھولوں سے لدے ہوئے بہار کی پوشاک میں رونق افروز ہیں، کہیں پر سمندر خفگی سے اپنے ماتھے پر بل ڈالے ہوئے کوے کی طرح کالا ہو رہا ہے۔

''اے خدا!'' عقاب نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا، ''میں تیرا کہاں تک شکر ادا کروں، تو نے مجھے اڑنے کی ایسی طاقت دی ہے کہ دنیا میں کوئی بلندی نہیں ہے جہاں میں پہنچ نہ سکوں۔ میں فطرت کے منظروں کا لطف ایسی جگہ بیٹھ کر اٹھا سکتا ہوں جہاں کسی اور کی پہنچ نہیں۔''

ایک مکڑی ایک درخت کی شاخ سے بول اٹھی، ''تو آخر کیوں اپنے منہ میاں مٹھو بنتا ہے۔ کیا میں تجھ سے کچھ نیچی ہوں؟''

عقاب نے پھر دیکھا کہ ایک مکڑی نے اس کے چاروں طرف شاخوں پر اپنا جالا تن رکھا تھا اور اسے ایسا گھنا بنا رہی تھی گویا سورج تک کو عقاب کی نظروں سے چھپا دے گی۔

عقاب نے حیرت سے پوچھا، ''تو اتنی سر بلندی پر کیسے پہنچی؟ جب وہ پرندے بھی جنھیں تجھ سے زیادہ اڑنے کی طاقت ہے یہاں تک پہنچنے کا حوصلہ نہیں کرتے؟ تو کمزور اور بے پر کیا چیز ہے... کیا تو رینگ کر یہاں آئی ہے؟''

مکڑی نے جواب دیا۔ ''نہیں ایسا تو نہیں ہے۔''

''پھر تو یہاں کیسے آ گئی؟''

''جب تو اڑنے لگا تھا تو میں تیری دم سے چپک گئی اور تو نے خود مجھے یہاں پہنچا دیا۔ لیکن میں یہاں تیری مدد کے بغیر ٹھہر سکتی ہوں اور اس لیے میری گذارش ہے کہ تو اپنے آپ کو بے کار بڑا ظاہر نہ کر اور سمجھ لے کہ میں ہی...''

اتنے میں ایک طرف سے ہوا کا جھونکا آیا اور اس نے مکڑی کو اڑا کر زمین پر گرا دیا۔

میرا خیال ہے، اور آپ کو بھی مجھ سے اتفاق ہوگا، کہ دنیا میں ہزاروں لوگ ہیں جو اس مکڑی سے بہت مشابہ ہیں۔ ایسے لوگ بغیر کسی قابلیت اور محنت کے کسی بڑے آدمی کی دم میں لٹک کر کسی بلندی پر پہنچ جاتے ہیں اور پھر ایسا سینہ پھلا کر چلتے ہیں گویا خدا نے ان کو عقابوں کی سی قوت بخشی ہے۔ مگر ضرورت صرف اس کی ہے کہ کوئی ان کو ذرا سا پھونک دے اور وہ اپنے جامے سمیت پھر زمین پر پہنچ جاتے ہیں۔ ❁❁

غور کرنے کی بات

پروفیسر محمد مجیب (1902 تا 1985) مشہور ماہر تعلیم، قومی رہنما اور اردو کے ادیب تھے۔ انھوں نے روسی ادب کی تاریخ بھی دو جلدوں میں لکھی ہے۔ پروفیسر محمد مجیب مدتوں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر بھی رہے۔

لفظ "رینگ"/"رینگنا" کا تلفظ دونوں طرح صحیح ہے یعنی اس میں "ی" کو "ای" کی طرح پڑھیں یا "اے" کی طرح پڑھیں۔ دہلی اور پنجاب کے علاقہ میں عام طور پر رینگ/رینگنا میں "ی" کو "ای" کی طرح پڑھا جاتا ہے یعنی रींगना / रींग۔ ایسی "ی" کو "یائے معروف" کہتے ہیں۔

فرہنگ

کوہ قاف =	Caucasus, this mountain range is situated in Russia between Europe and Asia. It was believed that fairies lived there. There was also a belief that there is a mountain called "Qaf" which circles the earth.	काकेशस। यह पर्वत श्रंखला ऐशिया और यूरोप के मध्य सीमा के निकट रूस में है। यह माना जाता है कि इस पर्वत पर परियां रहती हैं। लोग यह भी मानते थे कि 'क़ाफ़' नाम की एक पर्वतीय श्रंखला पृथ्वी को चारों ओर से घेरे हुए है।
دیودار =	Black Pine	देवदार, चीड़। यह वृक्ष ऊंचे पर्वतीय क्षेत्रों में पाया जाता है। इसकी ऊंचाई भी बहुत अधिक होती है।

محو ہو جانا =	To be lost or absorbed in something	किसी वस्तु को देखकर तल्लीन हो जाना या किसी विचार में पूरी तरह खो जाना।
رونق افروز ہونا =	Increasing the attraction of some place by being there	किसी व्यक्ति द्वारा अपनी उपस्थिति से किसी जगह की शोभा बढ़ाना। शोभायमान होना।
سربلندی =	Great height	सफलता, प्रसिद्धि
اتفاق کرنا =	To agree	सहमत होना। किसी की बात को उचित मानकर उसे स्वीकार कर लेना।

شیر اور برہمن کا قصہ

نہال چند لاہوری

کسی جنگل میں ایک روز ایک برہمن کا گذر ہوا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک شیر موٹی رسی سے جکڑا ہوا پنجرے میں بند ہے۔ وہ شیر اس برہمن کو دیکھ کر نہایت غریبی سے گڑگڑانے لگا کہ اے دیوتا اگر تو میرے اس حال زار پر رحم کرے اور اس قید سے مجھ کو نجات دے تو اس جاں بخشی کے عوض ایک نہ ایک دن میں بھی تیرے کام آؤں گا۔ برہمن سادہ لوح کا دل شیر کے بلبلانے پر بھر آیا مگر عقل کے اندھے کو یہ نہ سوجھا کہ دشمن ہے اس کی بات کا اعتبار نہ کیا جائے۔ بے تامل دروازہ کھول کر اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔ بندی سے خلاصی ہوتے ہی اس خونخوار نے اس کوتہ اندیش کو چاہا کہ گردن پکڑ لے اپنے پیٹ میں ڈال لے۔ بیت ؎

نیکی کرنا بدوں سے ایسا ہے
جیسے نیکوں سے کی بدی تو نے

برہمن نے کہا کہ اے شیر میں نے تجھ سے بھلائی کی نیکی کی امید پر، اور تو ارادہ بدی کا رکھتا ہے ؏

میں نیکی سے گذرا بدی بھی نہ کر

شیر بولا کہ ہمارے مذہب میں نیکی کی جزا بدی ہے۔ اگر میرے کہنے کا اعتبار نہیں تو

چل دوسرے سے پچھوادوں۔ جو وہ کہے سو صحیح۔

اس جنگل میں ایک پرانا برگت کا درخت تھا۔ شیر اور برہمن اس کے پاس گئے۔ شیر نے اپنی درخواست اس سے ظاہر کی۔ اس نے جواب میں کہا" اے برہمن شیر سچ کہتا ہے۔ اس کے مذہب میں نیکی کا بدلہ بدی کے سوا کچھ نہیں۔ اے برہمن سن کہ میں برسر راہ ایک پاؤں سے کھڑا ہوں اور سب چھوٹے بڑے مسافروں پر سایہ کرتا ہوں۔ لیکن جو مسافر گرمی کا مارا ہوا میرے سائے میں آ کر دم لیتا ہے، بیٹھ کر ہوا کھاتا ہے، وہ چلتے وقت اپنے سر پر سایہ کرنے کو میری ڈالی توڑ کر لے جاتا ہے۔ کوئی میری شاخ کی لاٹھی بناتا ہے۔ کہہ تو سہی بھلائی کا عوض برا ہے کہ نہیں۔ شیر نے کہا" کہو دیوتا، اب کیا کہتے ہو؟" اس نے کہا کہ کسی اور سے بھی پوچھو۔ تب شیر نے چند قدم اور آگے جا کر راستے سے پوچھا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ شیر سچا ہے۔ سنو مصر جی، اکثر مسافر مجھے بھول کر اِدھر اُدھر بھٹکتے ہیں۔ جب میں اسے مل جاتا ہوں تب وہ بہ آرام تمام اپنی منزل مقصود کو پہنچتا ہے۔ لیکن اس نیکی کے بدلے وہ میری چھاتی پر پیشاب کرتا ہے۔ اس وقت برہمن نے کہا کہ تیسرے سے بھی اور دریافت کرلو، پھر جو تیری رضا مندی ہو، بہتر ہے۔ شیر آگے بڑھا۔ سامنے سے ایک گیدڑ ٹیلے پر نظر آیا۔ اس نے ارادہ بھاگنے کا کیا۔ تب شیر للکارا کہ تو کچھ اندیشہ نہ کر ہم ایک بات تجھ سے پوچھتے ہیں۔ تب وہ بولا کہ حضرت جو کچھ ارشاد کرنا ہو دور ہی سے فرمایئے۔ شیر نے کہا کہ اس برہمن نے مجھ سے نیکی کی ہے اور میں ارادہ اس سے بدی کا رکھتا ہوں۔ تو کہہ کیا کہتا ہے۔ گیدڑ نے عرض کی،" یہ جو بات آپ ارشاد کرتے ہیں، اس خاکسار کے خیال میں نہیں آئی۔ آدمی کی کیا اوقات کہ جو قوی ہیکل جانوروں کے شہنشاہ سے کہ جس کے روبرو انسان ہمیشہ سے بدتر ہے، کچھ نیکی کر سکے۔ مجھ کو ہرگز

اعتبار نہیں آتا جب تک میں اپنی آنکھ سے نہ دیکھوں۔ شیر نے کہا کہ آ، ہم دکھا دیں۔ پھر شیر برہمن کو لیے آگے آگے اور گیدڑ آہستہ آہستہ پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ ایک آن میں پنجرے کے پاس تینوں آن پہنچے۔ برہمن نے کہا کہ اے گیدڑ، شیر اسی پنجرے میں بند تھا۔ میں نے خلاص کیا۔ گیدڑ بولا، اتنا بڑا شیر اس چھوٹے سے پنجرے میں کیوں کر تھا؟ اب میرے روبرو اس میں جائے اور جس طرح اس کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے اسی صورت سے باندھ کر پھر تو کھولے تو میں جانوں۔ اس نے گیدڑ کے کہنے سے شیر کو خوب مضبوط باندھا اور مضبوط جکڑ کر پنجرے کا دروازہ بند کر کے کہا کہ اے گیدڑ دیکھ یہ کس طرح گرفتار تھا جو میں نے کھولا۔

تب گیدڑ بولا کہ پتھر پڑے تیری عقل پر۔ اے نادان، ایسے دشمن قوی سے نیکی کرنی اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارنی ہے۔

اے عزیز سچ ہے کہ جو کوئی بے صبری اور فریاد اپنے نفس کی جو مثل شیر جسم کے پنجرے میں بند ہے سنے اور اس کے حال پر رحم کر کے صبر و توکل کی رسی اس کے ہاتھ پاؤں سے کھول دے تو بہر صورت آپ کو اس کا لقمہ بنائے۔ مگر خضر رہنما کی دستگیری سے بچے۔

❀❀

غور کرنے کی بات

نہال چند لاہوری کی پیدائش دلی کی تھی لیکن وہ لاہور میں اتنی مدت رہے کہ لاہوری مشہور ہو گئے۔ سنہ 1802 کے آس پاس وہ فورٹ ولیم کالج کولکاتا سے منسلک تھے اور وہاں انھوں نے عزت اللہ بنگالی کے ایک فارسی قصے "گل بکاولی" کو "مذہب عشق" کے نام سے اردو جامہ پہنایا۔ لیکن انھوں نے سیدھا سادہ ترجمہ کرنے کے بجائے کہیں کچھ بڑھایا، بہت کچھ گھٹایا، اور بہت کچھ اپنے طور پر لکھا۔ سنہ 1804 میں چھپنے کے بعد یہ کتاب بے حد مقبول اور مشہور ہوئی

اور اسے جدید اردو نثر کی بنیادی کتابوں میں سمجھا جاتا ہے۔

نہال چند لاہوری کی زبان میں اکا دکا ہی ایسے لفظ ہیں جو اپنے پرانے پن کی وجہ سے ہماری سمجھ میں نہ آئیں یا بہت اجنبی لگیں۔ یہ ان کی بہت بڑی خوبی ہے۔ ''بندی'' بمعنی ''قید''، اور ''خلاصی ہونا'' بمعنی ''چھوٹ جانا'' اب نہیں بولتے۔ ''برگت'' کو آج کل ''برگد'' کہتے ہیں۔ ''اعتبار نہیں آتا جب تک...'' یہ پرانا روزمرہ ہے، یعنی ''اعتبار نہیں آ سکتا، اعتبار نہیں آئے گا جب تک...''۔ ''خضر رہنما کی دستگیری سے بچے''، یعنی ''حضرت خضر مدد کریں تو بچ جائے''۔

''نیکی کرنی''، ''کلہاڑی مارنی''، اس طرح کا فقرہ آپ کنہیا لال کپور کے مضمون میں بھی دیکھیں گے۔ آج کل ''نیکی کرنی/کرنا''، ''کلہاڑی مارنی/مارنا'' دونوں طرح ٹھیک مانا جاتا ہے، جو اچھا لگے، لکھئے۔ صفحہ 19 پر ہم نے شعر لکھنے کے پہلے ایک نشان ے بنایا ہے۔ یہ ''بیت''، یعنی شعر کی علامت ہے۔

فرہنگ

غریبی= Lowliness; humility	दरिद्रता, दीन–हीनता। किसी के आगे मजबूर होने की स्थिति। दीनता और विनय की स्थिति।
سادہ لوح= Foolish; trusting	मूर्ख, किसी की बात पर जल्दी विश्वास कर लेने वाला व्यक्ति।
بلبلانا= To cry violently; to whine	रोना, रिरियाना। अत्याधिक गर्मी या घुटन के कारण, या ज़्यादा चोट लगने इत्यादि परिस्थिति में अत्यन्त व्यथित हो जाना।

بندی=	Being tied; being in captivity	बन्दी, क़ैदी।
کوتہ اندیش=	Not far sighted, short sighted	जिसमें विवेक की कमी हो। अदूरदर्शी व्यक्ति।
گذرنا=	To quit; to give up	छोड़ना, त्यागना।
برگت=	A banyan tree (old pronunciation)	बरगद का प्राचीन उच्चारण।
برسرراہ=	On the way; beside the road	रास्ते में। रास्ते के किनारे।
مصر جی=	Pandit ji, a category of Brahmins is called "Misra/Mishra"; hence any Brahmin	मिश्रा जी, पंडित जी। ब्रहमणों की एक गोत्र (मिश्र या मिश्रा) इसी लिए किसी भी ब्रहमण को 'मिसिर जी' कह कर पुकार लिया जाता था।
خیال میں آنا=	To enter the understanding; to convince	समझ में आना।
قوی=	Powerful; strong	सशक्त, शक्तिपूर्ण।
ہیکل=	Body	शरीर
پشہ=	Gnat	डांस, मच्छर
خلاص کرنا=	To free; to rescue	स्वतन्त्र करना, छोड़ना।
نفس=	Body; physical desire	देह, शरीर, सांसारिक इच्छाएं, इन्द्रियों से सम्बन्धित।

توکل =	To place one's trust in God	ईश्वर पर भरोसा करना।
خضر =	A holy person who guides lost travellers	एक बुज़ुर्ग जो भटके हुए लोगों को रास्ता दिखाते हैं। कहा जाता है कि उन्होंने जीवन अमृत पी लिया था, इसलिए सदा जीवित रहेंगे।

ایلورا کے مندر

گستاو لی بان(Gustave Le Bon)
ترجمہ:سید علی بلگرامی

یہ مقام اورنگ آباد سے شمال اور مغرب کی جانب 23 کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ زیر زمین مندر تعداد میں قریب تیس کے ہیں اور پہاڑ کے دامن میں دو کلومیٹر کے فاصلے تک چلے گئے ہیں۔ یہ مندر اور ان سے ملی ہوئی خانقاہیں جن میں انسان کی کتنی ہی نسلوں نے سالہائے دراز تک سکونت کی تھی اور جن کی عظمت ہمیں مصر کی قدیم عمارتوں کی یاد دلاتی ہے، اب بالکل خالی اور سنسان ہیں۔

ایلورا کے مختلف مندر، مختلف ازمنہ میں تعمیر ہوئے ہیں۔ ان میں سے سب سے پرانا 500 مسیحی میں بنا اور سب سے نیا کیلاس ہے، جس کا زمانہ تقریباً 800 مسیحی ہے۔ پس، گویا یہ مجموعہ مندروں کا تین سو سال کے زمانہ میں تعمیر ہوا ہے۔ یعنی چھٹی صدی عیسوی سے نویں صدی عیسوی تک۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں بدھ مذہب برہمنی مذہب کی طرف مائل ہو گیا، اور بالآخر اس میں منضم ہو گیا۔ ان مندروں میں بدھ کی مورت، بہت سے دیوتاؤں سے گھری ہوئی ہے، جن میں سے نہ صرف بُدھسَت ہی ہیں، بلکہ بہت سے خالص برہمنی دیوتا بھی شامل ہیں۔ ان سب کو علیحدہ طور پر پہچاننا دشوار ہے۔ پس، ایلورا کے مندروں سے بھی ہمیں اس تغیر کے سمجھنے میں

مدد ملتی ہے، جو چھٹی صدی سے نویں صدی عیسوی تک بدھ مذہب میں واقع ہوا۔

ایلورا کے بعض مندر میدان میں واقع ہیں، لیکن زیادہ تر زیر زمین ہیں اور پہاڑ کو کھود کر بنائے گئے ہیں۔ ان میں کئی درجے ہیں، جو نہایت ہی موٹے اور عمدہ ترشے ہوئے ستونوں پر قائم ہیں۔ یہاں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نعل اسپی محراب جو پرانے زیر زمین بدھ مندروں میں دکھائی دیتی ہے، غائب ہو گئی ہے۔

ایلورا میں سب سے شاندار مندر اندر اور کیلاس ہیں۔ کیلاس پورا زیر زمین نہیں ہے کیوں کہ اس کا درمیانی حصہ پہاڑ سے علیحدہ اور کھلی جگہ واقع ہے۔ لیکن اس میں سرنگیں نکلی ہیں، جو پہاڑ کے اندر تک پہنچتی ہیں۔ یہ ایک برہمنی مندر شیو کے نام پر بنا ہوا ہے اور ہندو صناعین نے اپنے متخیلہ کی قوت کو اس کی سنگ تراشیوں میں صرف کیا ہے۔ اگر یہ کل سنگ تراشیاں یکجا کی جائیں تو ایک بڑی مجلد بھی ان کے لیے کافی نہ ہوگی۔ ان سنگ تراشیوں میں برہمنی مذہب کے کل دیوتا شامل کیے گئے ہیں اور مہابھارت کی مشہور کہانیاں بھی پتھر میں دکھائی گئی ہیں۔ اس مندر کے اوپر اور اندر رنگین تصاویر بھی تھیں، جن کا اب صرف نشان ہی نشان رہ گیا ہے۔ کیلاس کا مندر ایک لال پتھر کا بنا ہوا ہے اور ایک مستطیل صحن میں واقع ہے، جس کے اطراف کی دیواروں کی جگہ خود پہاڑ ہیں۔ انھیں دیواروں میں زیر زمین دالان اور حجرے کاٹ کر نکالے گئے ہیں اور یہ سنگ تراشیوں سے پُر ہیں۔ خود مندر جو اس صحن کے بیچ میں ہے، ایک چٹان سے کندہ کیا گیا ہے اور اس کی بلندی تقریباً 32 گز ہے۔ اس صحن میں داخل ہونے کا راستہ ایک سائبان میں سے ہے، جو ستونوں سے وابستہ ہے۔ اندر ایک بڑا دالان ہے، جو ستونوں پر قائم ہے اور اس کے گرد عبادت گاہیں بنی ہوئی ہیں۔ اس ساری عمارت کے گرد شیر اور ہاتھی اور مختلف عجیب الخلقت حیوانات بنے

ہوئے ہیں، جو گویا اس کو تھامے ہوئے ہیں۔

ہند کی عمارتوں میں ان عجیب یادگاروں اور کھجوراہو، بیجا نگر اور نیپال کی یادگاروں نے میرے دل کو نہایت متاثر کیا۔ بھوک پیاس، سفر کی ماندگی، راتوں کی بد خوابی یہ سب تکالیف ایسے عجائبات کے سامنے بالکل فراموش ہو جاتے ہیں۔ علاء الدین کا عجیب وغریب چراغ اس سے زیادہ پرستانی عمارت کھڑی نہ کر سکتا جس کی خوبیوں اور باریکیوں کو عکسی تصاویر ہرگز ظاہر نہیں کر سکتیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسری ہی دنیا کے صناعین نے ایک سلسلہ مندروں کا بنایا ہے، جو پہاڑ کے اندر تک چلے گئے ہیں۔ یہ کل عمارتیں دیوتاؤں اور دیویوں، جانوروں اور خلاف فطرت مخلوقوں کی مورتوں سے بھری ہوئی ہیں۔ ان میں مہیب اور خوفناک صورت کے دیوتا ہیں، جن کے گرد پتھر کے دیو کھڑے ہیں اور انسان کو قریب جانے سے ڈرا رہے ہیں۔ انھیں کے ساتھ ایک طرف دلربا دیویاں ہیں، جو تبسم کے ساتھ ہاتھ بڑھائے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف ناچنے والیاں ہیں، جن کی دھج انسان کی خواہش نفسانی کو ہیجان میں لاتی ہے۔ کسی طرف دیوتا اور دیویاں عشق و محبت کی ہم آغوشیوں میں سرشار ہیں۔ غرض یہ سنگی مخلوق، جو اسی قدر پرانی ہے، جیسی دنیا، عجیب الخلقت صورتیں، طوائفیں اور گانے والیاں، جدھر دیکھو ادھر نظر آتی ہیں اور ان کا سلسلہ پہاڑ کے اندر تک چلا جاتا ہے۔ سیڑھیوں سے اوپر چڑھو، نیچے اترو، آگے بڑھو، پھر چڑھو، غرض جہاں جاؤ مشعل کی روشنی میں یہی صورتیں نظر آتی ہیں، کبھی تبسم کرتی ہوئی، کبھی تیوریاں چڑھاتے ہوئے۔ غرض انسان کو چکر آنے لگتا ہے اور وہ خیال کرتا ہے کہ کسی عجائبات کی دنیا میں پہنچ گیا۔ ❀❀

غور کرنے کی بات

(1) سید علی بلگرامی (1851 تا 1911) اپنے وقت کے بہت مشہور آدمی تھے۔ وہ نظام حیدر آباد کی حکومت میں بڑے عہدے پر رہے۔ وہ سنسکرت اور فرانسیسی بھی خوب جانتے تھے۔ ان کے زمانے میں ایک فرانسیسی مصنف گستاولی بان (Gustave Le Bon) نے دو بہت مشہور کتابیں لکھیں۔ دونوں کا ترجمہ سید علی بلگرامی نے ''تمدن ہند'' اور ''تمدن عرب'' کے نام سے کیا۔ جو اقتباس آپ کے سامنے ہے وہ ''تمدن ہند'' سے لیا گیا ہے۔

''کتنی ہی/ کتنے'' اور ''کتنی/ کتنے'' کو بعض اوقات کثرت ظاہر کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، جیسا کہ بلگرامی نے لکھا ہے، ''انسان کی کتنی ہی نسلوں''، یعنی ''بہت سی نسلوں''۔ اسی طرح، ہم کہتے ہیں، ''ہم آپس میں کتنی باتیں کرتے تھے''، یعنی ''بہت سی باتیں کرتے تھے''۔

''مجموعہ مندروں کا''، یعنی ''مندروں کا مجموعہ''۔ ''کا/ کی/ کے'' کو بعد میں لانے کا یہ طرز پہلے زمانے میں بہت عام تھا، اب اسے برا سمجھتے ہیں۔

سید علی بلگرامی نے ''500 مسیحی'' اور ''800 مسیحی'' لکھا ہے۔ اس زمانے میں سنہ کو ظاہر کرنے کے لیے لفظ ''عیسوی'' زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ انھوں نے بھی بعد میں ''چھٹی صدی عیسوی'' اور نویں صدی عیسوی'' لکھا ہے۔ جیسا کہ ہم آپ کو بتا چکے ہیں، آج کل مغربی ملکوں میں تاریخ کو بیان کرنے کے لیے ''مسیحی'' یا ''عیسوی'' نہیں لکھا جاتا۔ ہم نے تجویز کیا ہے کہ اس کی جگہ ''حالی'' لکھا جائے۔

''بودھست'' سے عام طور پر ''بودھی ستوا'' مراد لیتے ہیں یعنی ایسا شخص جسے عرفان حاصل ہو چکا ہو، یعنی مہا تما بدھ۔ اسی طرح، مصنف نے ''برہمنی مذہب'' سے ہندو مذہب مراد لی ہے، یعنی وہ مذہب برہمن جس کے پروہت ہوتے ہیں۔

''صناع'' کی عربی جمع ''صناعین'' ہے، لیکن اردو میں عام طور پر ''صناعان'' مستعمل ہے۔

بلگرامی نے ''کتاب'' کے لیے لفظ ''مجلد'' استعمال کیا ہے۔ آج کل ''مجلد'' سے ایسی

کتاب یا کاپی مراد لیتے ہیں، جس پر گتے کی جلد ہو۔

''حیوان'' لفظ کو عام طور پر جانور کے لیے استعمال کرتے ہیں، خاص کر جنگلی جانور کے لیے۔ اس کے اصل معنی ہیں، وہ جس میں جان ہو۔ لہٰذا اصولی طور پر انسان کو بھی حیوان کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں انسان ایسا حیوان ہے جو بولتا ہے۔

فرہنگ

ازمنہ =	Times; Periods	'ज़माना' का बहुवचन। काल, समय
مسیحی =	Relating to Christ; Christian	ईसा मसीह से सम्बन्धित, ईसाई, क्रिस्चियन।
منضم ہونا =	To be mixed or joined, so as to become one	मिश्रित होना। दो या उनसे अधिक चीज़ों का आपस में इस तरह मिल जाना कि वे एक हो जाएं।
پس =	Finally; So; Therefore	अतः, अन्ततः, अतैव।
نعل اپسی محراب =	Arch that is made in the shape of a horse shoe	घोड़े की नाल जैसी आकृति वाली डाट या महराब।
مخیلہ قوت =	The power of the imagination	किसी वस्तु को या विचार को कल्पना में लाने की शक्ति। कल्पना शक्ति।

مستطیل =	Rectangle	आयत, आयताकार।
ڈال پتھر =	A single block of stone or rock	पत्थर का एक बड़ा टुकड़ा या चट्टान।
خواہش نفسانی =	Sensual desire; Carnal desire	शारीरिक इच्छा जिसका सम्बन्ध यौन से हो।
ہیجان =	Excitement	उत्तेजना, क्षोभ, आवेश
عجیب الخلقت =	Man or animal having an astonishing or strange shape	विलक्षण या आश्चर्य जनक आकार वाला व्यक्ति या जानवर इत्यादि।
صناعین =	Artisans, plural of صناع; Here it denotes sculptors	'सन्ना' का बहुवचन। कारीगर, कलाकार, मूर्तिकार।

1880 میں ریل کا سفر

الطاف حسین حالی

ایام تعطیل میں دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کے لیے ہم کو چند مقامات میں دورہ کرنے کا اتفاق ہوا اور ہم علی گڈھ سے دہلی پہنچے اور جناب آنریبل سید احمد خان بہادر کی کوٹھی پر ٹھہرے۔

اب کی ہم نے مدرسۃ العلوم کو تیسری بار دیکھا اور اس کی روز افزوں ترقی دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ طلبا کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بہت سے بے خبر اور ناواقف لوگ جو اپنی اولاد کو یہاں بھیجتے ہوئے ڈرتے تھے، وہ اب نہایت اطمینان اور دل جمعی سے اپنی اولاد کو بھیجنے لگے ہیں۔ مدرسے میں دو چار کے سوا، جو کہ مریض تھے، ہم نے سب مسلمان طالب علموں کو روزہ دار پایا۔

علی گڈھ میں پانچ روز ٹھہر کر ہم فیروز آباد، اٹاوہ، مین پوری اور کانپور ہوتے ہوئے ہمیر پور پہنچے۔ فیروز آباد ضلع آگرہ کا مشہور قصبہ ہے جس میں سرکاری تھانہ اور تحصیل بھی ہے۔ یہاں کھجور کے پٹھے کی پنکھیاں ایسی عمدہ بنتی ہیں کہ ہندوستان میں شاید ہی کہیں اور بنتی ہوں۔ سادی پنکھیاں، جن پر کسی قدر ریشم کا کام ہوتا ہے، ایک روپیہ قیمت کی ہم نے بھی یہاں خریدیں۔ یہاں کے مسلمان جو پہلے بہت آسودہ اور مرفہ الحال تھے، اب اس قدر پست حالت میں ہیں کہ وہاں کے ذی اعتبار باشندوں

میں ان کا ذکر بھی نہیں آتا۔

جب ہم کانپور پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہاں سے ہمیر پور تک اونٹ گاڑی کے سوا کوئی سواری نہیں جاتی۔ اس لیے لاچار اسی میں جانا پڑا، اور اتفاقاً ہم کو اوپر کے درجے میں جگہ ملی۔ ہم کو یاد نہیں کہ ہم نے کبھی کسی سواری، یا پیدل چلنے میں ایسی تکلیف اٹھائی ہو جیسی اس اونٹ گاڑی میں پہنچی۔ ریل کے زمانے سے پہلے یہی سواریاں نہایت غنیمت سمجھی جاتی تھیں، مگر اب ان کے نام سے ہول آتی ہے۔ افسوس کہ یورپ کی صنعتیں روز ہم کو پرلے درجے کا آرام طلب بناتی جاتی ہیں۔ اور اب وہ تمام اسباب اور ذریعے مفقود ہیں جن کے باعث سے کبھی کبھی ہم کو جفاکشی اور محنت کرنے کا موقع ملتا رہے۔

ہمیر پور کو جاتے ہوئے پچھّم کی طرف سڑک سے کسی قدر فاصلے پر ہم نے ایک مندر دیکھا جو بیربر کا بنایا ہوا مشہور ہے۔ گو یہ مندر کچھ زیادہ شاندار نہیں ہے، مگر اس سنسان جنگل میں ایک ایسے زمانے کو یاد دلاتا ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں ''طلائی زمانہ'' کہلانے کا مستحق ہے۔

مراجعت کے وقت ہم ایک دن آگرہ میں ٹھہر کر الور پہنچے۔ یہاں ہم کو راجپوتانہ اسٹیٹ ریلوے میں بیٹھنا پڑا۔ چونکہ یہ سرکاری ریل ہے، اس وجہ سے ہم کو امید تھی کہ اس میں زیادہ آرام ملے گا۔ مگر برخلاف اس کے سب سے زیادہ اسی میں تکلیف اٹھانی پڑی۔ اول تو اس میں انٹرمیڈیٹ کلاس نہ ہونے سے بڑا نقص ہے، کیونکہ متوسط الحال آدمیوں کے لیے یہ درجہ فرسٹ کلاس کا حکم رکھتا ہے۔ دوسرے، گاڑیاں اس قدر چھوٹی ہیں کہ ایک کمرے میں صرف چار آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ باوجود اس کے ایک ایک کمرے میں آٹھ آٹھ آدمی نہیں بیٹھ لیتے، تب تک دوسرا کمرہ

نہیں کھولا جاتا، حالانکہ اسی کلاس کی پانچ پانچ سات سات گاڑیاں ٹرین میں خالی جاتی ہیں۔

ہم رات کی ٹرین میں سوار ہوئے تھے اور ہماری گاڑی کے کسی کمرے میں آٹھ آدمی سے کم نہ تھے۔ نیند کے مارے ایک دوسرے پر گرا پڑتا تھا اور تمام راستے مسافروں میں باہم تکرار ہوتی رہی۔ صبح کے سات بجے ہم باندی کوئی پہنچے اور دس دن تک یہاں ٹھہرے رہے۔ وہاں سے چل کر ساڑھے بارہ بجے الور پہنچے اور دوپہر تک نئی سرائے میں، جو کیڈل صاحب پولیٹیکل ایجنٹ کے عہد میں تیار ہوئی ہے، ٹھہرے۔ اس سرائے کی عمارت بالکل سنگین ہے۔ ظاہراً ہندوستان میں یہ پہلی سرائے ہے جس میں ایک مسافر کی آرائش اور تمام ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ رات کو ہمارے ایک معزز دوست نے ہم کو اپنے مکان پر بلا لیا اور پانچ روز تک ہم انھیں کے مکان پر ٹھہرے رہے۔

الور شہر کی آبادی عین دامن کوہ میں واقع ہوئی ہے، اور اسی وجہ سے شہر کا شمالی حصہ جنوبی حصے سے کسی قدر بلند ہے۔ یہاں کے بازار اگرچہ وسیع نہیں، مگر پر رونق ضرور ہیں۔ شہر سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ایک سیتلا کا مندر ہے جس کو وہاں کے لوگ ''سیلی سیڑھ'' کہتے ہیں۔ (''سیلی سیڑھ'' کے لفظی معنی ''ٹھنڈی سیتلا'' کے ہیں۔) یہاں دو طرف سے پہاڑ آکر مل گیا ہے اور ایک مثلث کی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ اس مثلث کے گوشے میں ایک بڑا اور مستحکم بند باندھا گیا ہے جس میں وقتاً فوقتاً بارش کا پانی دونوں پہاڑوں سے جھر جھر کر اکٹھا ہوتا رہتا ہے اور یہاں سے الور تک ایک پختہ نہر بنی ہوئی ہے جس کے ذریعہ سے بند کا پانی رستے کے تمام کھیتوں کو سیراب کرتا شہر تک پہنچتا ہے اور وہاں جا کر الور کے تمام باغات اور اس کے تمام

سوادکوسال بھرتک سرسبز وشاداب رکھتا ہے۔ بند کے ایک جانب پہاڑ پرنہایت پختہ گھاٹ تقریباً پاؤ میل اونچا بنا ہوا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر جا کرختم ہو جاتا ہے۔ وہاں سرکاری محل بنے ہوئے ہیں۔ یہ مہاراجہ بنے سنگھ کی ایک نمود اور یادگار ہے جو ہمیشہ ان کے عہدِ حکومت کو یاددلائے گی۔

ہم ماسٹر سری رام صاحب کے، جو مہاراجہ کے پرائیویٹ سکریٹری ہیں، اور جناب کنج بہاری لال صاحب، ہیڈ ماسٹر، ہائی اسکول، الور کے دل سے شکر گذار ہیں کہ جن کی عنایت سے ہم نے الور کی خاطر خواہ سیر کی۔ پانچ روز الور میں ٹھہر کر ہم رمضان کی انتیسویں تاریخ دن کی ریل سے الور سے روانہ ہوئے اور شام کو دلی میں پہنچ گئے۔ ❁❁

غور کرنے کی بات

حالی کی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر موضوع پر اس طرح لکھتے ہیں گویا کوئی پڑھا لکھا سنجیدہ اور مہذب شخص اپنے ہی جیسے کسی شخص سے بات کر رہا ہو۔ ''مقدمۂ شعر وشاعری''، جس کا چھوٹا سا حصہ آپ آگے پڑھیں گے، خاصے مشکل موضوعات پر مبنی ہے۔ اس کے برخلاف، زیرِ نظر سفرنامہ بالکل گھریلو سے معاملات کو بیان کرتا ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ دونوں اقتباسات میں زبان یکساں طرح کی سنجیدہ لیکن آسان ہے۔ لیکن سفرنامہ چونکہ ایک رسالے میں چھپنا تھا، اس لیے اکثر ایک کی جگہ دو لفظ لکھے گئے ہیں، مثلاً:

بے خبر/ ناواقف

آسودہ/ مرفہ الحال

جفاکشی/ محنت

انگریزوں کے زمانے میں بعض اعلیٰ رتبہ لوگوں کو آنریبل (Honourable) کہتے تھے۔ حالی کے وقت، بلکہ اس کے کچھ بعد تک، اردو میں بھی یہ رسم رہی۔ سنہ 1880 تک سید احمد

خان کو "سر" کا خطاب نہیں ملا تھا، لیکن ان کو سی۔ایس۔آئی۔ (Commander of the Star of India) کا خطاب مل چکا تھا، لہٰذا حالی نے انھیں آنریبل لکھا ہے۔ انھوں نے سید احمد کو "خان"، اور پھر "بہادر" بھی لکھا ہے۔ "خان" کا خطاب تو مغلیہ بادشاہوں کی طرف سے ان کے لیے خاندانی تھا، اور نام کے آگے "بہادر" لگانے کی رسم مغلیہ دور کے آخری زمانے میں رائج تھی اور انگریزوں کے زمانے میں بھی بہت دن تک رائج رہی۔

حالی نے ہر جگہ خود کو "ہم" لکھا ہے، لیکن ان کی مراد "میں" ہے۔ خود کو "ہم" کہنا پہلے زمانے کی اردو میں بہت رائج تھا۔ اب زیادہ تر مشرقی علاقوں کی اردو میں ملتا ہے۔

علی گڈھ کالج، جس کا پورا نام Muhammadan Anglo Oriental College تھا، اور جو بعد میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی بنا، اسے حالی نے "مدرسۃ العلوم" لکھا ہے۔ سر سید احمد خان اور ان کے ساتھی یوں ہی لکھتے تھے، کچھ اس وجہ سے، کہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ علی گڈھ کالج میں اگر انگریزی تعلیم ہوتی تھی تو وہاں اسلامی (یعنی مسلمانوں کے طرز کی) تعلیم بھی تھی، اور کچھ اس وجہ سے، کہ کالج کے تمام بنیاد گذاروں کا یہی خیال تھا کہ یہاں تمام علوم کی تعلیم دی جائے گی۔

بیربر، یعنی راجہ بیربل، اکبر کا مشہور درباری تھا۔ حالی نے انگریزوں کا خوف کیے بغیر مغل عہد، خاص کر اکبر کے عہد، کو ہندوستانی تاریخ کا طلائی زمانہ (Golden Period) کہا ہے۔ مندر کا ذکر کر کے انھوں نے یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ مغل عہد میں نئے مندر بھی بنتے تھے۔ "طلائی زمانہ" انگریزی فقرے Golden Period کا ترجمہ ہے۔ یہ کچھ زیادہ رائج نہیں ہوا، اس کی جگہ "سنہری دور/سنہرا دور" کہتے ہیں۔

سرکاری ریل سے مراد یہ ہے کہ وہاں کا نظام ریل ریاستی حکومت کے قبضے میں تھا۔ اس کے برخلاف، جن علاقوں میں انگریزوں کی حکومت براہ راست تھی، وہاں نجی کمپنیاں ریل چلاتی تھیں۔ انٹرمیڈیٹ کلاس Intermediate Class کو بعد میں عام طور پر "انٹر کلاس" کہنے لگے تھے۔ آزادی کے پہلے ریل گاڑیوں میں درجے حسب ذیل تھے: تیسرا، یعنی Third، انٹرمیڈیٹ، یعنی Intermediate، سکنڈ، فرسٹ۔ (حالی کے بہت بعد کچھ گاڑیوں میں ایئر

کنڈیشنڈ ڈبے بھی ہونے لگے تھے)۔دولت مند ہندوستانی سکنڈ میں سفر کرتے تھے، اوسط درجے کے لوگ انٹر میں، اور عام لوگ تھرڈ میں۔حالی کے زمانے کے بہت بعد تک ہندوستانیوں کو فرسٹ کلاس میں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔

حالی نے جہاں ''کمرہ'' لکھا ہے وہاں اب ''ڈبہ'' رائج ہے، یعنی ریل گاڑی کا کمپارٹمنٹ۔

پاؤمیل، یہ فقرہ پہلے زمانے میں رائج تھا۔اب کہنا ہوتو عام طور پر چوتھائی میل کہیں گے۔

''لاچار'' یعنی ''مجبور''۔اسے ''ناچار'' بھی بولتے ہیں۔بعض لوگ ''لاچار'' کو غلط سمجھتے ہیں۔لیکن جب حالی نے لکھا ہے تو اس کے غلط ہونے کا سوال نہیں اٹھتا۔یوں بھی، زبان کا اصول یہ ہے کہ جو لفظ رائج ہوجائے وہ صحیح ہے۔''ہول'' بمعنی ''ڈر'' مذکر ہے۔حالی نے شاید کسی مقامی محاورے کی پابندی کرتے ہوئے مونث لکھا ہے۔''تکرار'' بمعنی ''جھگڑا، زبانی لڑائی'' اردو والوں کا لفظ ہے۔عربی میں ''تکرار'' کے معنی ہیں ''دہرانا''۔لیکن اردو میں ''جھگڑا، زبانی لڑائی'' کے معنی میں رائج ہوگیا ہے اور اردو کے لیے یہی صحیح ہے۔

فرہنگ

ایام = Days; Plural of یوم	'यौम' का बहुवचन। दिन, दिवस
تعطیل = Holiday	छुट्टी, अवकाश।
روزافزوں = Increasing daily	दिन प्रतिदिन, बढ़ता हुआ / बढ़ती हुई।
دل جمعی = To be collected in mind, to be without anxiety	निश्चिन्ता, संतोष
پٹھا = Long pointed leaf	बड़ा, नोकदार पत्ता।

آسودہ=	In a state of content	अच्छी स्थिति में, निश्चिन्त, धनी
مرفّہ الحال=	Affluent	खुशहाल, धनी।
ہَول=	Terror, fear	डर, भय, हौल।
صنعت=	Industry, industrial product	उद्योग, औद्योगिक उत्पाद
مفقود=	Non-existent	लापता, लुप्त, ऐसी वस्तु जो विद्यमान न हो।
غنیمت=	A piece of good fortune	सौभाग्य से मिली वस्तुएं, अवसर इत्यादि। वरदान, महत्तव देने योग्य
سیتلا=	The small pox, the goddess of small pox	शीतला, चेचक, चेचक की देवी।
جھرنا=	To fall drop by drop; to flow in a thin stream	कम पानी का धीरे–धीरे बहना, बूंद बूंद टपकना।
سواد=	Suburb	किसी नगर का बाहरी क्षेत्र।
نمود=	Something by which someone is remembered	स्मृति–चिन्ह, निशानी, प्रदर्शन, दिखावा, इत्यादि।

کچھ پرانے شاعروں کے حالات

مولانا محمد حسین آزاد

سید خواجہ میر درد

درد تخلص، خواجہ میر نام، خاندان ان کا دلی میں بہ باعث پیری و مریدی کے نہایت معزز اور معظم تھا۔ دربار شاہی سے بزرگوں کی جاگیریں چلی آتی تھیں، امیر غریب خدمت کو سعادت سمجھتے تھے۔ یہ بے فکر بیٹھے اللہ اللہ کرتے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ نے خودان کے یہاں آنا چاہا اور انھوں نے قبول نہ کیا۔ مگر ماہ بہ ماہ ایک معمولی جلسہ اہل تصوف کا ہوتا تھا، اس میں بادشاہ بے اطلاع چلے آئے۔ اتفاقاً اس دن بادشاہ کے پاؤں میں درد تھا، اس لیے ذرا پاؤں پھیلا دیا۔ انھوں نے کہا یہ امر فقیر کے آداب محفل کے خلاف ہے۔ بادشاہ نے عذر کیا کہ معاف کیجیے عارضے سے معذور ہوں۔ انھوں نے کہا: عارضہ تھا تو تکلیف کرنی کیا ضرور تھی۔

موسیقی میں اچھی مہارت تھی۔ بڑے بڑے باکمال گویے اپنی چیزیں بنظر اصلاح لاکر سنایا کرتے تھے۔ راگ ایک پرتاثیر چیز ہے۔ فلاسفۂ یونان اور حکماے سلف نے اسے ریاضی کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔ دل کو فرحت اور روح کو عروج دیتا ہے۔ اس واسطے اہل تصوف کے اکثر فرقوں نے اسے بھی عبادت میں شامل کیا ہے۔

ایک شخص لکھنؤ دلی سے چلے ۔ مرزا رفیع کے پاس گئے اور کہا کہ دلی جاتا ہوں، کسی یار آشنا کو کچھ کہنا ہو تو کہہ دیجیے۔ مرزا بولے: بھائی، دلی میں میرا کون ہے۔ ہاں خواجہ میر درد کی طرف جا نکلو تو سلام کہہ دینا۔

ذرا خیال کر کے دیکھو۔ مرزا رفیع جیسے شخص کو دلی بھر میں (اور دلی بھی اس زمانے کی دلی) کوئی آدمی معلوم نہ ہوا، اِلّا وہ۔ کیا کیا جواہر تھے اور کیا کیا جوہری۔

سید محمد میر سوز

انھوں نے علاوہ شاعری کے شعر خوانی کا ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا کہ جس سے کلام کا لطف دو چند ہو جاتا تھا۔ شعر کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے۔ اور لوگ بھی نقل اتارتے تھے، مگر وہ بات کہاں۔ آواز دردناک تھی، شعر نہایت نرمی اور سوز و گداز سے پڑھتے تھے اور اس میں ہاتھ سے بھی مدد لیتے تھے۔ مثلاً شمع کا مضمون باندھتے تو پڑھتے وقت ایک ہاتھ سے شمع اور دوسرے کی اوٹ سے وہیں فانوس تیار کر کے بتاتے۔ بے دماغی یا ناراضی کا مضمون ہوتا تو خود بھی تیوری چڑھا کر وہیں بگڑ جاتے۔

ایک غزل میں ایک قطعہ اس انداز سے سنایا تھا کہ سارے مشاعرے کے لوگ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

او مار سیاہ زلف سچ کہہ
بتلا دے دل جہاں چھپا ہو
کنڈلی تلے دیکھیو نہ ہووے
کاٹا نہ ہفی ترا برا ہو

پہلے مصرعے پر ڈرتے ڈرتے بچ کر جھکے، گویا کنڈلی تلے دیکھنے کو جھکے ہیں۔

اور جس وقت کہا: ''کاٹا نہ ہفی''، بس دفعۃً ہاتھ کو چھاتی تلے مسوس کر ایسے بے اختیار لوٹ گئے کہ لوگ گھبرا کر سنبھالنے کو کھڑے ہو گئے۔ (صحیح ''افعی'' ہے، محاورے میں ''ہفی'' کہتے ہیں۔) ❀❀

غور کرنے کی بات

مولانا محمد حسین آزاد (1831 تا 1910) اردو کے سب سے بڑے نثر نگار مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اردو کے شعرا کے بارے میں ایک کتاب ''آب حیات'' لکھی جو 1880 میں چھپی اور فوراً ہی مقبول ہو کر کئی بار چھپی اور وہ آج بھی پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔ اس کتاب میں اور باتوں کے علاوہ بعض بعض شاعروں کے واقعات اور ان کی باتیں اس قدر دلچسپ انداز میں لکھی ہوئی ہیں کہ شاعر کی تصویر سامنے آجاتی ہے اور خود اس کی شاعری کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔

سید خواجہ میر درد (1720 تا 1785) بہت بڑے صوفی بھی تھے اور ان کی شاعری میں صوفیانہ باتیں بہت ہیں۔ میرزا محمد رفیع سودا (1706 تا 1781) کو اس زمانے میں بہت سے لوگ اپنے وقت کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے تھے، اور آج بھی ان کا نام بہت مشہور ہے۔

مولانا آزاد نے ''بہ باعث پیری و مریدی کے'' لکھا ہے۔ یہ پرانا انداز ہے۔ اس زمانے میں ''پیری ومریدی کے باعث'' لکھیں گے۔

''معمولی'' کو آج کل ''غیر اہم، زیادہ قیمت کا نہیں'' کے معنی میں بولتے ہیں۔ مولانا کے زمانے میں اسے ''مقررہ طریقے کے مطابق'' کے معنی میں بولتے تھے۔

''عارضہ'' اور اس طرح کے لفظ جن کے آخر میں چھوٹی ہ یا الف ہو، بعض حالات میں ان کا آخری حرف اس طرح بولا جاتا ہے گویا وہ بڑی ے ہو۔ اس کو ''امالہ'' (جھکانا) کہتے ہیں۔ خیال رکھیے کہ اگر ایسے لفظوں کے آخر میں بڑی ے نہ بھی لکھی جائے تو انھیں اس طرح بولیں گے گویا ان کا آخری حرف بڑی ے ہو۔

''جا نکلنا'' اردو کا خاص محاورہ ہے۔ اسی طرح ''آ نکلنا''، ''ہو نکلنا'' بھی ہیں۔

میر سوز کے بیان میں مولانا نے لکھا ہے کہ لفظ ''افعی'' کو محاورے میں ''ہفی'' بولتے ہیں۔ یہاں ''محاورہ'' سے مراد ''عام بول چال'' ہے۔ مولانا نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ عام بول چال میں ''ہفی'' ہے۔ ''فرہنگ آصفیہ'' میں اس کا ایک تلفظ ''ہفئی'' بھی لکھا ہے اور بتایا ہے کہ اس کے ایک معنی ''بہت چالاک اور پھرتیلا'' بھی ہوتے ہیں۔ ان معنی کے اعتبار سے میر سوز نے لفظ ''ہفی'' کو اور بھی عمدگی سے استعمال کیا ہے کہ سانپ بہت تیزی سے جھپٹ کر ڈستا ہے۔ میر سوز کے قطعے کا لطف اس بات میں ہے کہ شاعری میں زلف کو سانپ یا اژدہے سے تشبیہ دیتے ہیں اور ''کنڈلی'' کے ایک معنی ہیں ''بالوں کا گھونگر'' اور دوسرے معنی ہیں ''سانپ کے بیٹھنے کا طریقہ'' اور تیسرے معنی خود ''سانپ'' ہیں۔ لہٰذا لفظ ''کنڈلی'' یہاں لفظ ''ہفی'' سے بھی کچھ بڑھ کر کارآمد ہے۔

فرہنگ

پیری =	Providing spiritual guidance to the people	लोगों का आध्यात्मिक मार्ग–दर्शन।
مریدی =	To obtain spiritual guidance from someone, especially a holy man	किसी पीर (आध्यात्मिक मार्ग दर्शक) से आध्यात्मिक शिक्षा लेना।
امر =	Thing or fact	बात
فقیر =	One who has nothing; spoken here out of humility	ऐसा व्यक्ति जिसके पास कुछ न हो। यहां विनय के साथ स्वयं को तुच्छ दर्शाया गया है।
عارضہ =	Illness	व्याधि, बीमारी।

فلاسفہ=	Philosophers; plural of "failsuf"	दार्शनिक लोग। 'फ़ैलसूफ़' का बहुवचन, जिसका अर्थ है फ़लसफ़ी या दार्शनिक।
حکما=	Learned and wise people; plural of "hakim"; In Arabic, there is a hamza at the end of this word [hukama']. This spelling is no longer in use in Urdu	ज्ञानी और बुद्धिमान लोग। यह अरबी शब्द 'हकीम' का बहुवचन है। अरबी में 'हुकमा' के अन्त में 'हम्ज़ा' आता है। उर्दू में बिना हम्ज़ा के ही लिखा जाने लगा है
سلف=	Past, preceding, former (times)	अतीत से सम्बन्धित, पूर्वज
الا=	Except	(के) अतिरिक्त, (को) छोड़कर, (के) सिवा, सिवाए
دوچند=	Double	दुगना/दुगनी
کنڈلی=	Curl of a lock (of hair)	घूंघर (घुंघराले बालों का)
جواہر=	Jewellery, gemstones, etc., here used for people of high quality	बहुमूल्य पत्थर, मोती इत्यादि। यहां उच्चकोटि के लोगों के लिए प्रयोग किया गया है।
مضمون=	The theme of a verse is called its "mazmun"	विषय वस्तु। जो बात शेर में कही गई हो वह उसका मज़मून कहलाती है।

مضمون باندھنا =	To depict something in a verse	किसी मज़मून को शेर में लाना।
قطعہ =	A poem all of whose verses are interconnected but which doesn't have a matla'	ऐसी नज़्म (कविता) जिसमें सब शेर आपस में सम्बन्ध रखते हों और जिसमें 'मतला' न हो।
مطلع =	The first verse of any kind of poem whose first two lines rhyme	ग़ज़ल या नज़्म का पहला शेर जिसकी दोनों पंक्तियों में 'क़ाफ़िया' हो, अर्थात अन्तिम शब्दों का स्वर एक सा हो।

شریمد بھگوت گیتا

(اقتباس از باب13)

بے شک مسلسل مشق سے عرفان بہتر ہے۔مراقبہ عرفان سے بہتر ہے۔مراقبہ سے ثمرہ، یعنی اعمال کے ثمرے کوترک کرنا بہتر ہے۔اور ترک کرنے سے فوراً فراغت واطمینان حاصل ہوجاتا ہے۔

اس طرح فراغت واطمینان کو حاصل کرنے والا انسان جو کسی سے نفرت نہیں کرتا، جو سب جانداروں کا بھلا کرتا ہے، جو رحم دل ہے، جو خودی اور غرور سے خالی ہے، جو دکھ اور سکھ کو یکساں سمجھتا ہے اور قصور کرنے والوں کو بھی بخشنے والا ہے، اور جو ذہن یوگ میں لگا ہوا، نفع نقصان میں مطمئن رہنے والا ہے اور دل، حواس وغیرہ، یعنی اپنے جسم کو قابو میں کیے ہوئے ہے، جو مجھ میں پختہ یقین رکھتا ہے، وہ میرے سپرد کیے ہوئے دل اور ذہن والا، عبادت کرنے والا، وہی مجھ کو پیارا ہے۔

اور جس شخص سے نہ تو لوگوں کو رنج وغم ہوتا ہے اور جو خود لوگوں سے رنج وغم بھی نہیں پاتا ہے، ایسا ہی شخص جو غصہ، خوف اور رنج سے مبرا ہے، وہی مجھے پیارا ہے۔

جو انسان خواہشات سے مبرا، اندر باہر سے پاک اور باہوش ہے، یعنی وہ جس کام کے لیے آیا تھا اس کو پورا کر چکا ہے، جو بے تعصب ہے اور رنج وغم سے

آزاد ہے، اور جس نے اعمال کا آغاز، یعنی نتیجہ حاصل کرنے کی کوشش، ترک کردی ہے، وہ عبادت کرنے والا مجھ کو عزیز ہے۔

اور جو نہ کبھی خوش ہوتا ہے، نہ نفرت کرتا ہے، نہ دکھی ہوتا ہے، نہ خواہش کرتا ہے، اور سب بھلے برے اعمال کے ثمرے کو ترک کرنے والا ہے، وہ عبادت کرنے والا انسان مجھ کو عزیز ہے۔

(ترجمہ وترجمانی: اجے مالوی)

❀❀

غور کرنے کی بات

بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، یا اس میں مسلمانوں کی باتوں کے سوا بہت کم ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اردو ہندوستان کی واحد زبان ہے جس کے بولنے والے اور لکھنے والے ملک کے ہر مذہب اور ہر طبقے کے لوگ رہے ہیں اور بڑی حد تک اب بھی ہیں۔ اسی طرح، غیر مسلموں کی بہت سی مقدس کتابیں اور مذہبی تعلیمات اردو میں بھی موجود ہیں۔ ایک شریمد بھگوت گیتا کو لیجیے تو اردو میں اس کے پچاس سے زیادہ ترجمے ہو چکے ہیں۔ ان میں مشہور پاکستانی ادیب، شاعر، لغت نویس اور عالم شان الحق حقی کا بھی منظوم ترجمہ شامل ہے جو کچھ مدت ہوئی پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں شائع ہوا ہے۔ زیر نظر انتخاب ہم نے الہ آباد کے ایک نوجوان اردو عالم اور سنسکرت کے ماہر اجے مالوی کے ترجمے سے لیا ہے۔ سمجھنے میں سہولت کی خاطر ہم نے ایک جگہ زبان کچھ آسان کردی ہے۔

فرہنگ

عرفان =	The knowledge of God	ख़ुदा के बारे में ज्ञान, उच्च कोटि का आध्यात्मिक अनुभव।
مراقبہ =	Meditation	ध्यान, चिन्तन– मनन।
ثمرہ =	Fruit, result, reward	फल, परिणाम, पुरस्कार।
یوگ =	Being engaged in profound and abstract meditation; The force of devotion	आध्यात्मिक ध्यान में लीन होना, ईश्वर में रमने की शक्ति।
مبرا =	Not affected; Separate	बरी, स्वतन्त्र। अलग या दूर किया हुआ।

میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں

پریم چند

بندہ نواز تسلیم! یاد آوری کا مشکور ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی فرمائش کی تعمیل نہ کرسکا۔ کچھ تو عدیم الفرصتی کا مرض دامن گیر ہے اور کچھ حافظہ کی کمزوری۔ اب کوشش کرتا ہوں۔

میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر محض کسی واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا کسی جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔ زمین تیار ہونے پر میں کیرکٹروں کو تخلیق کرتا ہوں۔ بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں۔ لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا، تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔

میں جب تک کوئی افسانہ اول سے آخر تک ذہن میں جما نہ لوں، لکھنے نہیں بیٹھتا۔ کیرکٹروں کا اختراع اسی اعتبار سے کرتا ہوں کہ اس افسانے کے حسب حال ہوں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پرسطوت واقعے پر رکھوں۔ اگر افسانے میں نفسیاتی کلائمکس موجود ہو تو خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو،

میں اس کی پروانہیں کرتا۔ ابھی میں نے ہندی میں ایک افسانہ لکھا ہے، جس کا نام ہے ''دل کی رانی''۔ میں نے تاریخ اسلام میں تیمور کی زندگی کا ایک واقعہ پڑھا تھا، جس میں حمیدہ بیگم سے اس کی شادی کا ذکر ہے۔ مجھے فوراً اس تاریخی واقعے کے ڈرامائی پہلو کا خیال آیا۔ تاریخ میں کلائمکس نہ تھا۔ وہ کلائمکس پیدا ہو، اس کی فکر شروع ہوئی۔ حمیدہ بیگم نے بچپن میں اپنے باپ سے فن حرب کی تعلیم پائی تھی اور میدان جنگ میں کچھ تجربہ بھی حاصل کیا تھا۔ تیمور نے ہزار ہا ترکوں کو قتل کر دیا تھا۔ ایسے دشمن قوم سے ایک ترک عورت کس طرح مانوس ہوگئی؟ یہ عقدہ حل ہونے سے کلائمکس نکل آتا ہے۔ تیمور وجیہ نہ تھا۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ اس میں ایسے اخلاقی اور جذباتی محاسن پیدا کیے جائیں جو ایک عالی نفس خاتون کو اس کی طرف مائل کر سکیں، اس طرح وہ قصہ تیار ہو گیا۔

کبھی کبھی سنے سنائے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر افسانہ کی بنیاد آسانی سے رکھی جا سکتی ہے لیکن کوئی واقعہ محض لچھے دار اور چست عبارت میں لکھنے اور انشا پردازانہ کمالات کی بنیاد پر افسانہ نہیں ہوتا۔ میں اس میں کلائمکس لازمی چیز سمجھتا ہوں، اور وہ بھی نفسیاتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ افسانے کے مدارج اس طرح قائم کیے جائیں کہ کلائمکس قریب تر آجائے۔

جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے، جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے، تو میں واقعے سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی کیفیت افسانے کی روح ہے۔

میں بہت ست رفتار ہوں، مہینے بھر میں شاید میں نے کبھی دو افسانوں سے زائد نہیں لکھے۔ بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا۔ واقعہ اور کیرکٹر سب مل

جاتے ہیں لیکن نفسیاتی بنیاد بمشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو جانے پر افسانہ لکھنے میں دیر نہیں لگتی۔

مگر ان چند سطور سے افسانہ نویسی کے حقوق نہیں بیان کر سکتا۔ یہ ایک ذہنی امر ہے۔ سیکھنے سے بھی لوگ افسانہ نویس بن جاتے ہیں، لیکن شاعری کی طرح اس کے لیے بھی اور ادب کے ہر ایک شعبہ کے لیے کچھ فطری مناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے آپ پلاٹ بناتی ہے، ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے، تاثیر لاتی ہے، ادبی خوبیاں جمع کرتی ہے، نادانستہ طور پر آپ ہی آپ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ ہاں قصہ ختم ہو جانے کے بعد میں خود اسے پڑھتا ہوں۔ اگر اس میں مجھے خود کچھ ندرت، کچھ جدت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس ہوتا ہے، تو میں اسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں۔ ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہو گیا۔ حالانکہ فیل اور پاس دونوں افسانے شائع ہو جاتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس افسانے کو میں نے فیل سمجھا تھا، اسے احباب نے بہت زیادہ پسند کیا ہے۔ اس لیے میں اپنے معیار پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا۔

غور کرنے کی بات

پریم چند (1880 تا 1936) کو عام طور پر اردو کا سب سے بڑا افسانہ اور ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کا یہ خط ہم نے حکیم محمد یوسف حسن، ایڈیٹر ''نیرنگ خیال'' کی مرتب کی ہوئی کتاب سے لیا ہے۔ اس میں اس زمانے کے ہر بڑے افسانہ نگار نے اپنے اپنے طور پر بتانا چاہا ہے کہ میں افسانہ کیوں اور کیوں کر لکھتا ہوں۔ کیوں سے مراد یہ ہے کہ افسانہ لکھنے کی وجہ کیا ہے اور کیوں کر سے مراد یہ ہے کہ افسانہ لکھا کس طرح جاتا ہے؟

پریم چند کی تحریر ہمیں افسانہ لکھنے کے ایک خاص طریقے اور مقصد کے بارے میں بتاتی

ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ سب افسانے اسی طرح لکھے جاتے ہوں اور ہر افسانہ نگار کا طریقہ یہی ہو۔ لیکن پریم چند کا دکھایا ہوا راستہ آج بھی بہت مقبول ہے۔ پریم چند کی یہ بات بہت اہم ہے کہ جس شخص کے مزاج میں افسانہ لکھنے کا ذوق ہے، اسے فطرت سب کچھ نہیں تو بہت کچھ خود سکھا دیتی ہے۔ عربی میں ایک کہاوت ہے **الشعراءُ تلامیذُ الرحمٰن**، یعنی شاعر لوگوں کا استاد خدا ہے۔ پریم چند نے بھی کچھ ایسی ہی بات کہی ہے۔

پریم چند نے ''مشکور'' کو ''شکر گذار'' کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس کو بعض لوگ عربی کے قاعدے سے غلط سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارا سروکار تو اردو سے ہے۔ عربی میں چاہے یہ غلط ہو لیکن اردو میں اسے بڑے بڑے ادیبوں نے استعمال کیا ہے جن میں سے ایک پریم چند کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ لہٰذا ''مشکور'' کو ''شکر گذار'' کے معنی میں صحیح سمجھنا چاہئے۔

پریم چند نے لفظ ''کیرکٹر'' (Character) استعمال کیا ہے۔ آج کل اس کی جگہ لفظ ''کردار'' رائج ہے لیکن اگر ''کیرکٹر'' لکھا بھی جائے تو اسے ''کیریکٹر'' لکھتے ہیں۔

پریم چند نے ''نفسیاتی'' لفظ اکثر استعمال کیا ہے۔ لفظ ''نفسیات'' اردو میں انگریزی لفظ Psychology کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کہ انسان کی ذہنی کیفیات کے مطالعے پر مبنی ایک علم ہے۔ پریم چند نے لفظ ''اختراع'' کو مذکر لکھا ہے۔ اب اسے عام طور پر مونث لکھتے ہیں، لیکن اگر مذکر لکھا جائے تو غلط نہ ٹھہرے گا۔

پریم چند نے لفظ Climax بار بار لکھا ہے۔ آج کل ہم عام طور پر ''نقطۂ عروج'' کہتے ہیں، یعنی کسی بیان، یا کسی واقعے کا وہ حصہ جس میں بیان یا واقعہ اپنے سب سے زیادہ اہم یا موثر موڑ پر پہنچے۔ اسی طرح انھوں نے Dramatic کے لیے ''ڈرامائی'' لکھا ہے جو آج بھی رائج ہے۔ پریم چند کی تحریر میں انگریزی الفاظ کے ہونے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زبان کس طرح ترقی کرتی ہوئی انگریزی لفظوں کو ممکن حد تک چھوڑ کر ان کی جگہ اردو الفاظ اختراع یا ایجاد کرتی جا رہی ہے۔

''حقیقت کی تازگی'' سے مراد یہ ہے کہ افسانے میں جو بات بیان ہو اس میں سچائی اور حقیقی زندگی کا رنگ تو ہو، لیکن اس میں نیا پن بھی ہو، پرانی گھسی پٹی باتیں ہی نہ ہوں۔

فرہنگ

مشکور =	Thankful	कृतज्ञ
عدیم الفرصتی =	Lack of leisure	फुर्सत या अवकाश का न होना।
کیرکٹر =	Character (of fiction)	कहानी / उपन्यास के पात्र, चरित्र
اختراع کرنا =	To invent	ईजाद या अविष्कार करना।
پرسطوت =	Full of power and awe	ऐश्वर्य और तेज से पूर्ण। प्रतापी, महिमा युक्त।
نفسیاتی =	Psychological	मनोवैज्ञानिक
کلائمکس =	Culmination, climax	चरमोत्कर्ष
حرب =	Battle	युद्ध, लड़ाई
امر =	Matter	बात, मामला, काम
مناسب =	Suitable	यथोचित, उचित
ندرت =	Newness, The quality of not being common	अनोखापन, नयापन, नवीनता
دامن گیر ہونا =	To prevent	रोकना
محاسن =	Plural of "muhsana", Good qualities. There is a similar word "madarij" below	'मुहसिना' का बहुवचन। गुण

نفس =	Spirit, Temperament	आत्मा, प्रकृति, स्वभाव।
مدارج =	Plular of "madraja", Stages	'मद्रिजा' का बहुवचन। मदारिज़ का अर्थ हुआ चरण, मंज़िलें या दर्जे

عصمت آپا: ایک شام کی گفتگو

شکیلہ رفیق

میں بولی، ''سوال یہ ہے کہ صرف مطالعے کے بل پر اوریجنل کہانی تخلیق نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس میں مشاہدہ یا تجربہ شامل نہ ہو۔ تجربے کے بغیر گہرائی کیوں کر آئے گی... یا آسکتی ہے؟ آپ کیا کہتی ہیں؟''

پہلے تو ان کی آنکھیں مسکرائیں، پھر لب متبسم ہوئے اور... انھوں نے شفقت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا، ''ابھی تمھاری عمر ہی کیا ہے، وقت کے ساتھ ساتھ لکھنے والے میں اتنی سمجھ آجاتی ہے اور آجائے گی کہ اس پر نہ بھی بیتے تو... وہ بتا لیتی۔''

''یعنی؟ جھیل لے خود ہی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، جھیل لے... اب ایک شخص ہے جسے ذلت وخواری ملی ہے دنیا سے، وہ کچلا گیا، پیسا گیا، ذلیل ہوا، خوار ہوا، یہ آپ کو بھی پسند نہیں۔ آپ اپنی تحریر میں کسی کی صرف ذلت وخواری دکھاتے پھر رہے ہیں، وہ دب دبا کے رہ جاتا ہے، حالانکہ اس کا دل چاہتا ہے کہ دنیا سے لڑے، بدلہ لے۔ اب اگر وہ خود مصنف ہے اور وہ سب اسی پر بیتی ہے تو اپنی تحریر میں لوگوں کے منہ پر طمانچہ مار کے اس تسکین کو حاصل کر لیتا ہے، مطلب یہ ہے کہ تم خود، وہ شخص بن جاؤ اور... سوچو کہ اگر میرے ساتھ یہ ہوتا تو میں کیا کرتی؟ وہ دکھ مجھ پر پڑتا تو میرا ردعمل کیا ہوتا؟ ہیں؟ ہوسکتا ہے نہ کہ مجھ

پر پڑتی تو میں یہ ترکیب کرتی، ہے نہ؟''

وہ کرتو سوال رہی تھیں مگر انداز بالکل یہ تھا کہ جواب اثبات میں چاہتی ہوں۔ مگر میں نے انھیں سے پوچھا۔'' خودآپ لکھتے وقت کیا سوچ رکھتی ہیں؟''

وہ فوراً ہی بولیں۔'' میں نے تو کہانیاں یوں شروع کیں کہ کوئی کردار لیا اور سوچا کہ میرے ساتھ ایسا ہوتا تو میں کیا کرتی، یعنی اگر مجھ پر پڑتا تو...میں کہانی میں وہ بات کروا دیتی جو'' میرا'' دل کرنے کو چاہتا ہے۔ وہ بے وقوف ہے، جو ایسا نہیں کرتا۔ میں نے تو اپنی کہانیاں اسی سوچ کے ساتھ لکھنا شروع کیں کہ...اس حرکت پہ جوتے مارنے کا دل چاہا تو مار دیے۔ بےوقوف، تو نے یہ حرکت کیا کی...؟ یہ کیوں نہ کیا؟ تو کیا تم نے بھی ایسا کیا کہ جو باتیں تم نے نہیں کی تھیں، وہ بھی کروا دیتیں... بعض کہانیوں میں؟''

ان کی چمکدار اور متجسس نگاہیں مجھ پر جم گئیں۔

'' ہاں ایسا ہوا تو ہے۔''

'' تو اس وقت شعور نہیں تھا لکھنے کا ایسا، اتنا کرنے کا...لیکن جب شعور آ گیا تو...''

پھر وہ میری حیران نگاہیں دیکھ کر بولیں۔'' میں اپنی بات کر رہی ہوں۔ شعور آنے کے بعد لکھا تو لوگ کہنے لگے یہ تو تمھاری کہانی ہے...مصنف لکھتے وقت سوچتا ہے کہ لوگ کہیں یہ نہ کہیں کہ تمھاری کہانی ہے۔ کہہ دو... ہاں، میں نے جھیلی ہے یہ کہانی...اور جھیلنا کوئی جسمانی ہی نہیں ہوتا ہے، دماغی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے... جسمانی طور پر تو بیل بھی پٹتا ہے، بکری بھی، مگر بیل بن کے جو کولھو میں پستا ہے... مطلب یہ کہ لکھنے والا اگر چاہے تو بیل اور بکری بن کے بھی لکھ سکتا ہے...کیوں کہ بیل

اور بکری تو نہیں لکھ سکتے، مصنف سوچ سکتا ہے کہ بیل اس وقت کیا سوچ رہا ہوگا، اگر میں بیل ہوتا تو...'' وہ بولتے بولتے رکیں اور ہنس کر کہا۔'' ویسے میں نے ایسی کوئی کہانی نہیں لکھی...میں انسانی بیل ہوں۔''

'' تو وہ جو اتنے ڈھیر سارے اردو کے رائٹر اور ان کی کہانیاں آئی ہیں منظر عام پر ہندوستان میں؟''

میرے سوال پر وہ منھ بنا کر بولیں۔'' وہ کام میں آنے والی نہیں ہیں، آئندہ اور پھر...آج کل کا انسان تو روپئے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ کس کام سے کتنا روپیہ ملنے والا ہے، بس یہی اولیت ہے اب تو.... بہت کم ایسے خوش نصیب ہیں جو علم کو علم کے لیے حاصل کر رہے ہیں...سب کچھ کر رہے ہیں بس... چند شوقین نکل آتے ہیں مگر افسوس تو یہ ہے کہ وہ علم سے بھی محروم ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف لکھ پتی، کروڑ پتی بھی نہیں بن پاتے۔''

عصمت آپا سے گفتگو کے دوران ایک اہم بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ کہ ان کی تحریر میں جو حرکت، تیزی اور طوفان کی سی بلا خیزی ہے، وہی ان کی گفتگو کا بھی خاصہ ہے۔

❀❀

غور کرنے کی بات

عصمت چغتائی (1915 تا 1991) ہماری بہت مشہور فکشن نگاروں اور ڈراما نگاروں میں ہیں۔ انھوں نے بعض ادیبوں کے خاکے بھی بہت عمدہ لکھے، خاص کر اپنے مزاح نگار مریض بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ جو انھوں نے '' دوزخی'' کے عنوان سے لکھا، وہ تو شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ شروع شروع میں انھوں نے لڑکیوں اور عورتوں کے جذبات اور احساسات اور ان کے ذہنی اور نفسیاتی کیفیات پر مبنی کچھ ایسے افسانے لکھے جنھیں اس زمانے میں خلاف تہذیب سمجھا

گیا، لیکن ان افسانوں کی وجہ سے ان کی شہرت بھی بہت ہوئی۔ ترقی پسند تحریک کا اس زمانے میں بہت بول بالا تھا اور انھیں ترقی پسندوں میں بھی شمار کیا گیا۔

عصمت چغتائی نے فلموں کے لیے بھی لکھا اور اکا دکا فلم میں کام بھی کیا۔ ان کے شوہر شاہد لطیف اپنے زمانے کے جانے پہچانے ڈائرکٹر تھے۔ عصمت چغتائی کو متوسط طبقہ کی مسلمان عورتوں کے رہن سہن اور گھریلو حالات وغیرہ کے حالات کے بارے میں غیر معمولی لیاقت تھی اور اس کو انھوں نے اپنی تحریروں میں خوب استعمال کیا ہے۔ وہ زبان بھی بہت عمدہ اور رواں لکھتی تھیں اور گفتگو بھی اچھی کرتی تھیں۔

شکیلہ رفیق موجودہ زمانے کی جانی پہچانی افسانہ نگار ہیں۔ آج کل وہ کناڈا کے شہر ٹورانٹو (Toronto) میں قیام پذیر ہیں۔ انھوں نے عصمت چغتائی سے اپنی بات چیت کو ''عصمت آپا: اس ایک شام کی گفتگو'' نامی چھوٹی سی کتاب میں پیش کیا ہے۔ ہمارا یہ سبق اسی کتاب میں سے انتخاب ہے۔

عصمت چغتائی نے اس بات پر گفتگو کی ہے کہ افسانہ یا ناول نگار جو لکھتا ہے، کیا وہ کسی نہ کسی حیثیت سے خود بھی اس پر بیت چکا ہوتا ہے؟ انھوں نے بہت عمدہ بات کہی ہے کہ اصل چیز یہ ہے کہ افسانہ یا ناول نگار اپنے دل دماغ کے اندر ان باتوں کو محسوس کرے یعنی ''جھیلے''، جن کو اس نے اپنی تحریر میں بیان کیا ہے۔

پریم چند کو آپ پڑھ چکے ہیں کہ انھوں نے کہا ہے کہ جب کوئی نفسیاتی نکتہ سامنے آتا ہے تو میں اس پر افسانہ لکھتا ہوں۔ عصمت چغتائی کا کہنا ہے کہ جب ان کے ذہن میں کوئی کردار یا کسی کردار کی جھلک نمایاں ہوتی ہے تو اس سے انھیں افسانہ لکھنے کی تحریک ملتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اس معاملے پر گفتگو کی ہے جو آگے آئے گی۔

شکیلہ رفیق نے '' کیا سوچ رکھتی ہیں'' کہا ہے، بمعنی '' آپ کے خیالات کیا ہوتے ہیں''۔ ان معنی میں '' سوچ رکھنا'' مقامی محاورہ ہے، ابھی ہر جگہ عام نہیں ہوا۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ عصمت چغتائی کہتی ہیں کہ مجھ سے جو باتیں زندگی میں نہ بن سکیں ان کو میں نے افسانے میں ڈال دیا۔

سب سے خاص بات جو عصمت چغتائی نے کہی وہ یہ ہے کہ علم کو علم کی خاطر حاصل کرنا چاہیے۔

فرہنگ

اوریجنل = Original	मौलिक। स्वयं लिखी हुई कोई रचना, स्वयं बनाई हुई कोई बात जो किसी से नक़ल न की गई हो, न अनुवाद हो।
متجسس = Curious	जिज्ञासु, चीज़ों को जानने की जिज्ञासा रखने वाला।
اِثبات = Affirmative	सकारात्मक, स्वीकारात्मक, प्रतिपादन
شعور = Sense; Understanding	संज्ञा, संवेदना, समझ, बुद्धि, विवेक
رائٹر = Writer	लेखक
بلا خیزی = The quality of having power and excitement	बहुत उत्तेजित होने की स्थिति, उत्तेजना
خاصہ = Quality; Characteristic	विशेषता, विशिष्टता।

قرۃ العین حیدر کے اقوال

قرۃ العین حیدر

(جمیل اختر سے گفتگو، نوئیڈا، اگست 2001)

میں بس لکھ دیتی ہوں۔ جیسا سمجھ میں آتا ہے لکھ دیتی ہوں۔ میں اس پر غور نہیں کرتی کہ اس کا فلسفیانہ پہلو کیا ہے، نفسیاتی پہلو کیا ہے، معاشی پہلو کیا ہے، سماجی پہلو کیا ہے، اور تاریخی پہلو کیا ہے؟ یہ سب چیزیں میں نہیں کرتی، کوئی رائٹر نہیں کرتا۔ Creative process کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

فکشن تو دراصل عورتوں نے ہی لکھا ہے۔ ناول تو عورتوں نے ہی لکھے ہیں۔ جزئیات نگاری عورتوں نے ہی کی ہے۔ انسانی رشتوں کے بارے میں عورتوں ہی نے لکھا ہے۔

☆☆☆

(شفیع عقیل سے گفتگو، کراچی، 1953)

اس وقت کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر اچھا لکھتا ہے۔ اس کی کہانیاں وقت کی کہانیاں ہیں اور ہر کہانی میں ایک مقصد ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ ہمارے ہاں نئے لکھنے والوں میں جیلانی بانو مجھے بہت پسند آئیں۔

عصمت چغتائی مجھے بہت پسند ہیں۔ اشفاق[احمد] نے ایک آدھ چیز اچھی لکھی ہے۔ ہاجرہ مسرور نے دو تین اچھی چیزیں دی ہیں۔عزیز احمد کا صرف ایک ناول ''گریز'' اچھا ہے۔

☆☆☆

(سکریتا پال کمار سے گفتگو، مطبوعہ "طلوع افکار"، کراچی، مئی 1988)

اردو تو بہت وسیع اور مضبوط زبان ہے۔اس میں ہر لفظ کے ساتھ معنی کی بے انتہا سمتیں ہیں۔میرے لیے جو بات وجہ تشویش ہے وہ زبان کے استعمال کا بتدریج زوال ہے۔میں زبان کی صفائی کے بارے میں بہت پریشان ہوں، کیونکہ حسن اسی صفائی کے اندر موجود ہے۔جب میں دوردرشن پر بے تکی ہندی زبان سنتی ہوں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے، کیونکہ ہندی بھی حسین زبان ہے۔میں زبان کی تنگ دامانی نہیں محسوس کر سکی اور پوری سنجیدگی سے کہہ سکتی ہوں کہ اردو زبان میں الفاظ کی کمی نہیں ہے۔

☆☆☆

(حسن رضوی اور کچھ دوسرے ادیبوں سے گفتگو، لاهور، 1988)

''آگ کا دریا'' کے پہلے ایڈیشن1960 سے لے کر آج تک مجھے رائلٹی ادا نہیں کی گئی، جب کہ پاکستان میں میری رائلٹی کے قانونی حقدار موجود ہیں جن کو رائلٹی ادا کرنے کے لیے میں نے بار بار ناشرین کو لکھا۔اس ناول کے متعدد ایڈیشن پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں۔ان پر ناشرین کی طرف سے یہ اطلاع بھی موجود

ہے کہ" جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں"اور یہ کتاب مصنفہ کی اجازت سے شائع کی جارہی ہے۔

☆☆☆

(جاوید ناصر سے گفتگو، آل انڈیا ریڈیو، ممبئی، 1993)

میرے خیال میں ادب کا مقصد یہ ہے کہ جو چیز آپ پیش کررہے ہیں وہ آپ دیانت داری سے پیش کیجیے۔اس میں آپ زندگی کی خوبصورتی بھی دکھائیے اور زندگی میں جو بدصورتی ہے وہ بھی دکھائیے۔لیکن اس طرح سے نہیں کہ اس سے آپ کو زندگی سے ایسی نفرت پیدا ہو کہ آپ اسے morbidity کی طرف لے جائیں، بلکہ اس سے آپ کچھ بہتری پیدا کرنے کی کوشش کریں۔اس کو آپ کہیں گے کہ یہ بالکل پروپیگنڈے والی بات ہوئی۔لیکن میرا خیال ہے کہ آپ Greek Tragedy پڑھیے۔یعنی ٹریجڈی جو ہے اس سے آگے کی کوئی چیز نہیں۔لیکن اس کو پڑھ کر آپ کے اندر کیا ہوتا ہے؟ آپ کے اندر زندگی سے ٹکر لینے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔تو میرا خیال یہ ہے کہ آرٹ کا مقصد یہی ہونا چاہیے۔

☆☆☆

(آصف فرخی سے گفتگو، مطبوعہ 1999)

میں اودھ کے دیہات میں گئی، میں بھیا سے ملی، جن کا میں نے اس [ناول "گردشِ رنگِ چمن"] میں تذکرہ کیا ہے۔ میں نے یہاں وہ ماحول دیکھا جس کا تذکرہ صوفیا کی کتابوں میں پڑھا ہے۔ کس طرح لوگ بیٹھتے ہیں آکر، کس طرح باتیں ہوتی ہیں۔ کس طرح دیگیں چڑھتی ہیں، کس طرح ایک خاص ماحول ہوتا ہے۔ وہ ماحول میں نے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ دنیا بھی

ہندوستان میں موجود ہے اور گاؤں گاؤں موجود ہے۔

☆☆☆

میں جس معاشرے میں پیدا ہوئی، یہ بہت اچھا معاشرہ ہے۔ جو زبان میں بولتی ہوں، بڑی اچھی زبان ہے۔ اس سے زیادہ اچھی زبان ہو ہی نہیں سکتی۔

غور کرنے کی بات

قرۃ العین حیدر (1927 تا 2007) کو بجا طور پر صرف عورتوں کے درمیان نہیں، اور نہ صرف اردو ادب کے اعتبار سے، بلکہ سارے برصغیر کے تناظر میں بڑی ادیب کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں، ناولوں، تراجم اور مضامین کے پورے برصغیر کے ادب کو متمول بنایا۔ پاکستانی نقاد سہیل احمد خاں کا قول ہے کہ ''بیسویں صدی کے اردو ادب میں اتنا بڑا تخلیقی ذہن علامہ اقبال کے بعد مجھے تو اپنے طور پر قرۃ العین حیدر ہی کا نظر آتا ہے۔'' قرۃ العین حیدر کی بہت سی گفتگوئیں جمیل اختر نے اپنی کتاب ''نوائے سروش'' میں یکجا کر دی ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباسات اسی کتاب سے لیے گئے ہیں۔ قرۃ العین حیدر ان اقوال میں ایک بالغ نظر ادیب اور تہذیبی طور پر باخبر شخص نظر آتی ہیں۔ انھیں اپنی رایوں پر اعتماد ہے اور ان کی رایوں کے پیچھے ان کا مطالعہ اور فکر بھی ہے۔

پریم چند کی تحریر ''میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں'' اور ''عصمت آپا سے ایک گفتگو'' سے قرۃ العین حیدر کی باتوں کا موازنہ دلچسپ ہوگا۔ پریم چند نفسیاتی سچائی اور کردار نگاری کی بات کرتے ہیں۔ عصمت چغتائی تخلیق کو عمل کا بدل قرار دیتی ہیں اور قرۃ العین کے خیال میں ادب ہمارے اندر زندگی کے سامنے قائم ہونے اور قائم رہنے کا حوصلہ دیتا ہے۔

قرۃ العین یہ بھی کہتی ہیں کہ تخلیقی فن کار (جسے انھوں نے ''رائٹر'' یعنی لکھنے والا کہا ہے) کے تخلیقی عمل Creative process کی باریکیاں ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں جو خود فنکار نہیں ہیں، اسی لیے وہ لکھنے والے سے طرح طرح کے غیر ضروری سوال پوچھتے ہیں۔

عربی لفظ ''جزو'' سے اردو والوں نے ''جزئیات'' بنالیا ہے اور اس کے معنی کچھ بدل دیے ہیں۔ زبان میں ایسے عمل ہوتے رہتے ہیں۔ ''صوفی'' کی جمع ''صوفیاء'' بھی ہے اور ''صوفیہ'' بھی۔ قرۃ العین حیدر نے ''صوفیا'' کہا ہے جو بالکل ٹھیک ہے کیوں کہ اردو میں اس طرح کے لفظوں میں آخری ہمزہ نہیں بولا جاتا اور اکثر لکھا بھی نہیں جاتا۔

قرۃ العین حیدر کے خیال میں اچھا ادب مریضانہ ذہنیت نہیں پیدا کرتا۔ ''مریضانہ'' کے لیے انھوں نے انگریزی لفظ morbidity استعمال کیا ہے۔ عام بول چال میں اس طرح کے انگریزی لفظ در آتے ہیں، لیکن نہ آئیں تو بہتر ہے۔

فرہنگ

جزئیات نگاری = Depiction of minor details	लेखन में छोटी से छोटी बातों का वर्णन करना
بتدریج = Gradually	क्रमशः, क्रमिक रूप से, धीरे–धीरे
رائلٹی = Royalty	रायलटी। किताब लिखने के शुल्क के रूप में लेखक को दिया जाने वाला पैसा। स्वत्व–शुल्क।
ٹریجڈی = Tragedy	ट्रेजडी, दुखान्त, नाटक, कहानी या घटना इत्यादि।

مجھے میرے بزرگوں سے بچاؤ

کنہیالال کپور

میں ایک چھوٹا سا لڑکا ہوں۔ ایک بہت بڑے گھر میں رہتا ہوں۔ زندگی کے دن کاٹتا ہوں۔ چونکہ سب سے چھوٹا ہوں اس لیے گھر میں سب میرے بزرگ کہلاتے ہیں۔ یہ سب مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ انھیں چاہے اپنی صحت کا خیال نہ رہے، میری صحت کا خیال ضرور ستاتا ہے۔ دادا جی کو ہی لیجیے۔ یہ مجھے گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتے کیوں کہ باہر گرمی یا برف پڑ رہی ہے۔ بارش ہو رہی ہے یا درختوں کے پتے جھڑ رہے ہیں۔ کیا معلوم کوئی پتہ میرے سر پر تڑاخ سے لگے اور میری کھوپڑی پھوٹ جائے۔ ان کے خیال میں گھر اچھا خاصا قید خانہ ہونا چاہیے۔ ان کا بس چلے تو ہر ایک گھر کو جس میں بچے ہوتے ہیں سنٹرل جیل میں تبدیل کر کے رکھ دیں۔ وہ فرماتے ہیں، بچوں کو بزرگوں کی خدمت کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے وہ ہر وقت مجھ سے چلم بھرواتے یا پاؤں دبواتے رہتے ہیں۔

دادی جی بہت اچھی ہیں۔ پوپلا منھ، چہرے پر بے شمار جھریاں اور خیالات بے حد پرانے۔ ہر وقت مجھے بھوتوں جنوں اور چڑیلوں کی باتیں سنا سنا کر ڈراتی رہتی ہیں۔ ''دیکھ بیٹا مندر کے پاس جو پیپل ہے اس کے نیچے مت کھیلنا۔ اس کے اوپر ایک بھوت رہتا ہے۔ آج سے پچاس سال پہلے جب میری شادی نہیں ہوئی تھی میں اپنی

ایک سہیلی کے ساتھ اس پیپل کے نیچے کھیل رہی تھی کہ یک لخت میری سہیلی بے ہوش ہوگئی۔ اس طرح وہ سات دفعہ ہوش میں آئی اور سات دفعہ بے ہوش ہوگئی۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے چیخ کر کہا'' بھوت''! اور وہ پھر بے ہوش ہوگئی۔ اسے گھر پہنچایا گیا جہاں وہ سات دن کے بعد مر گئی۔ اور ہاں، پرانی سرائے کے پاس جو کنواں ہے اس کے نزدیک مت بھٹکنا۔ اس میں ایک چڑیل رہتی ہے۔ وہ بچوں کا کلیجہ نکال کر کھا جاتی ہے۔ اس چڑیل کی یہی خوراک ہے۔''

ماتا جی کو ہر وقت یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ پرماتما نہ کرے مجھے کچھ ہوگیا تو کیا ہوگا؟ وہ مجھے تالاب میں تیرنے کے لیے اس لیے نہیں جانے دیتیں کہ اگر میں ڈوب گیا تو؟ پٹاخوں اور پھلجھڑیوں سے اس لیے نہیں کھیلنے دیتیں کہ اگر کپڑوں میں آگ لگ گئی تو؟ پچھلے دنوں میں کرکٹ کھیلنا چاہتا تھا۔ ماتا جی کو پتہ لگ گیا۔ کہنے لگیں، کرکٹ مت کھیلنا۔ بڑا خطرناک کھیل ہے۔ پرماتما نہ کرے اگر گیند آنکھ پر لگ گئی تو؟

بڑے بھائی صاحب کا خیال ہے جو چیز بڑوں کے لیے بے ضرر ہے چھوٹوں کے لیے سخت مضر ہے۔ خود چوبیس گھنٹے پان کھاتے ہیں لیکن اگر کبھی مجھے پان کھاتا دیکھ لیں فوراً ناک بھوں چڑھائیں گے۔ پان نہیں کھانا چاہیے۔ بہت گندی عادت ہے۔ سنیما دیکھنے کے بہت شوقین ہیں لیکن اگر میں اصرار کروں تو کہیں گے، چھوٹوں کو فلمیں نہیں دیکھنا چاہئیں۔ اخلاق پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔

بڑی بہن کو گانے بجانے کا شوق ہے۔ ان کی فرمائشیں اس قسم کی ہوتی ہیں '' ہارمونیم پھر خراب ہوگیا ہے اسے ٹھیک کرالاؤ۔ ستار کے دو تار ٹوٹ گئے ہیں اسے میوزیکل ہاؤس لے جاؤ۔ طبلہ بڑی خوفناک آوازیں نکالنے لگا ہے اسے فلاں دکان پر چھوڑ آؤ۔'' جب انھیں کوئی کام لینا ہو تو بڑی میٹھی بن جاتی ہیں۔ کام نہ ہو تو کاٹنے کو

دوڑتی ہیں۔خاص کر جب ان کی سہیلیاں آتی ہیں اور وہ طرح طرح کی فضول باتیں بناتی ہیں، اس وقت میں انھیں زہر لگنے لگتا ہوں۔

لے دے کے سارے گھر میں ایک غمگسار ہے اور وہ ہے میرا کتا ''موتی''۔ بڑا شریف جانور ہے۔ وہ نہ تو بھوتوں اور چڑیلوں کے قصے سنا کر مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کرتا، نہ مجھے نالائق کہہ کر میری حوصلہ شکنی کرتا ہے۔اور نہ اسے جاسوسی ناول پڑھنے کا شوق ہے اور نہ ستار بجانے کا۔بس ذرا موج میں آئے تو تھوڑا سا بھونک لیتا ہے۔جب اپنے بزرگوں سے تنگ آجاتا ہوں تو اسے لے کر جنگل میں نکل جاتا ہوں۔وہاں ہم دونوں تیتریوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔دادا جی اور دادی جی سے دور۔ پتا جی اور ماتا جی سے دور۔ بھائی اور بہن کی دسترس سے دور۔اور کبھی کبھی کسی درخت کی چھاؤں میں موتی کے ساتھ ستاتے ہوئے میں سوچنے لگتا ہوں، کاش! میرے بزرگ سمجھ سکتے کہ میں بھی انسان ہوں۔ یا کاش، وہ اتنی جلدی نہ بھول جاتے کہ وہ کبھی میری طرح ایک چھوٹا سا لڑکا ہوا کرتے تھے۔ ❀❀

غور کرنے کی بات

کنہیالال کپور (1910 تا 1980) ہمارے مشہور مزاح نگاروں میں سے ہیں۔وہ انگریزی کے پروفیسر اور ایک بڑے کالج کے پرنسپل تھے۔انگریزی کے اثر سے ان کی تحریر میں ایک بے تکلفی ہے جس پر طنز یا ہجو کا بوجھ نہیں۔یعنی ان کا مزاح کم و بیش خالص مزاح ہوتا ہے۔ ان کے بزرگ ہم عصر اور دوست اور ان ہی کی طرح انگریزی کے پروفیسر پطرس بخاری (1898 تا 1958) بھی اسی انداز میں لکھتے تھے،لیکن ان کے یہاں طنز کچھ زیادہ نمایاں تھا۔ کنہیالال کپور کے موجودہ مضمون کا پطرس کے مضمون ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' کے ساتھ پڑھا جائے تو زیادہ لطف آئے گا۔دونوں پر انگریزی کا بھی خوشگوار اثر نظر آتا ہے۔لیکن

کنہیالال کپور کی زبان پطرس کی زبان سے زیادہ عام فہم ہے۔

''منھ'' ایسا لفظ ہے لوگ جسے طرح طرح لکھتے ہیں۔ دلی میں عام طور پر ''مونہہ'' لکھا جاتا ہے۔ کئی علاقوں میں ''منہ'' رائج ہے۔ زیادہ تر لوگ اسے ''منھ'' لکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہی املا بہتر ہے۔

کنہیالال کپور نے ''چاہئیں'' لکھا ہے۔ ''چاہئیں'' اور ''چاہیے'' دونوں املا درست ہیں۔ دہلی اور کئی مغربی علاقوں کے لوگ ''چاہئیں'' بولنا پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح، دہلی اور اس کے اطراف میں بولتے ہیں، ''مجھے کچھ کام کرنے ہیں''؛ ''مجھے ایک بات کہنی ہے''؛ ''انھیں کچھ بات عرض کرنی ہے''۔ اس کے برخلاف، لکھنو والے یوں کہتے ہیں: ''مجھے کچھ کام کرنا ہیں/ مجھے ایک بات کہنا ہے/ انھیں کچھ بات عرض کرنا ہے''۔ دونوں ہی طریقے صحیح ہیں۔ جہاں جو اچھا معلوم ہو، وہی استعمال کریں۔

فرہنگ

سنٹرل جیل =	Central Jail; The chief jail in a district	ज़िले का सब से बड़ा कारागार
یک لخت =	All at once; Suddenly	अचानक, अकस्मात, तुरन्त
انار =	A cherry bomb	एक गोल आतिशबाज़ी जिसे आग दिखाते हैं तो ऊंचाई पर जाकर इसमें से नन्ही–नन्ही चिंगारियां बहुत तेज़ी से उड़ती हैं।

بےضرر	Harmless	जो किसी प्रकार की हानि न पहुंचाए।
مضر =	Injurious	हानिकारक
میوزیکل ہاؤس =	Musical house; The name of a music shop	ऐसी दुकान का नाम जहां संगीत वाद्य या संगीत से सम्बन्धित सामान मिलता है, या उसकी मरम्मत की जाती है।
زہر لگنا =	To be extremely hateful	अत्याधिक बुरा लगना।
غم گسار =	Remover of grief; Consoler	सांत्वना देने वाला, दुख बंटाने वाला, सहयोगी।
تیتری =	Butterfly	तीतर की स्त्रीवाचक संज्ञा

اردو زبان کے بارے میں کچھ ضروری باتیں

الطاف حسین حالی

اردو تمام اطراف ہندوستان میں عموماً بولی اور سمجھی جاتی ہے، اور اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ اسی کو ہندوستان کی قومی زبان بنایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، اسی کو ترقی دی جائے۔

کوئی زبان تمام ملک میں یکساں طور پر اس وقت تک شائع نہیں ہو سکتی جب تک مندرجۂ ذیل ذریعے ملک میں مہیا نہ ہوں:

(1) اس زبان کی معتبر اور جامع ڈکشنری کا تیار ہونا۔

(2) اس کی جامع گریمر کا مرتب ہونا۔

(3) اس میں کثرت سے نظم و نثر کی کتابوں کا تصنیف و تالیف ہو کر شائع ہونا۔

(4) اس زبان کے اخبارات و رسائل کا تمام اطراف و جوانب ملک میں اشاعت پانا۔

اگرچہ یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ اردو لٹریچر کی جس قدر اشاعت ملک میں زیادہ ہوتی جاتی ہے، اسی قدر اردو زبان کی تحریر اور نظم و نثر لکھنے کا سلیقہ اطراف ہندوستان میں عموماً بڑھتا جاتا ہے، لیکن جو لوگ اپنے تئیں اردو زبان کا مالک سمجھتے

ہیں، یعنی اہل دہلی یا اہل لکھنؤ، ان کو اس بات پر فخر نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری زبان کا لوگ اتباع کرتے ہیں اور ہمارے روزمرہ کی پیروی کی جاتی ہے۔ ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ اگر وہ اپنی زبان کی خبر نہ لیں گے اور اس کے محفوظ رکھنے کے وسائل بہم نہ پہنچائیں گے، اس کے الفاظ ومحاورات کو نہایت احتیاط سے فراہم اور مرتب نہ کریں گے اور اس کی نظم ونثر کو زمانے کے مذاق کے موافق ترقی نہ دیں گے تو ان کی زبان کا وہ حصہ، جس پر ان کو فخر ہے، اور ان کی اور تمام ہندوستان کی اردو میں ما بہ الامتیاز ہے، وہ حرف غلط کی طرح صفحۂ روزگار سے محو ہو جائے گا۔ ❀❀

غور کرنے کی بات

مولانا الطاف حسین حالی (1837 تا 1914) ہمارے سب سے بڑے ادیبوں میں ہیں۔ وہ شاعر، تنقید نگار، سوانح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ قومی ترقی اور اصلاح کے بہت بڑے حامی تھے۔ انھوں نے اردو شاعری اور نثر کو نئی راہوں پر لگانے کے لیے کئی کتابیں لکھیں، نظمیں کہیں، اور عملی طور پر بھی بہت کچھ کیا۔ وہ غالب کے شاگرد اور سرسید کے حلقے کے بہت خاص لوگوں میں تھے۔ نظم میں حالی کی سب سے مشہور تصنیف ''مدوجزر اسلام'' (1879) ہے جسے عام طور پر ''مسدس حالی'' کہا جاتا ہے۔ سرسید نے اس کے بارے میں لکھا کہ قیامت کے دن جب خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تو کیا عمل لے کر آیا ہے، تو میں عرض کروں گا، '' حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں۔''

نثر میں حالی کی سب سے مشہور کتاب ان کے دیوان کا مقدمہ (1893) ہے۔ یہ ''مقدمۂ شعروشاعری'' کے نام سے مشہور ہے۔ ہر چند کہ حالی نے شاعری، اور اردو شاعری کے بارے میں جو باتیں اس کتاب میں بیان کی ہیں وہ سب کی سب پوری طرح صحیح نہیں ہیں، لیکن اپنے زمانے میں یہ کتاب بہت بااثر ثابت ہوئی اور آج بھی اس کا اثر باقی ہے۔

جس زمانے میں حالی نے یہ بات لکھی تھی کہ اردو زبان ہندوستان میں عام طور پر بولی

جاتی ہے،اس زمانے میں یہ بات بالکل صحیح تھی۔ملک کی دوسری زبانوں کے پھلنے پھولنے کی وجہ سے،اور ملک کی تقسیم کی وجہ سے،اردو کو پہلی والی مقبولیت نہ حاصل رہی۔لیکن اب بھی اس کے آسان روپ کو بولنے اور سمجھنے والے بہت ہیں۔مثال کے طور پر،فلموں کے مکالموں اور گانوں میں جو زبان عام طور پر استعمال ہوتی ہے،اسے اردو کے سوا کوئی نام نہیں دیا سکتا،لیکن کئی وجوہ سے اسے ہندی کہا جاتا ہے۔اسی طرح،شمالی ہند کی عام بولی اردو ہی ہے،لیکن اسے اکثر لوگ ہندی کے نام سے پکارتے ہیں۔بہرحال،ہمیں اس بات کو پوری طرح سمجھ لینا اور قبول کرنا چاہیے کہ اردو ہمارے ملک کی اہم زبانوں میں ہے۔

کسی زبان کو پورے ملک میں مقبول ہونے کے لیے جو چیزیں سب سے زیادہ ضروری ہیں،حالی نے انھیں بہت کم لفظوں میں بالکل ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا ہے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ کوئی ایک سو بیس سال بعد آج بھی وہ ساری ضروری چیزیں موجود نہیں ہیں۔

مولانا حالی نے تین انگریزی لفظ"ڈکشنری"(Dictionary)،گریمر (Grammar) اور"لٹریچر" لکھے ہیں۔آج کل ہم لٹریچر کو"ادب"،ڈکشنری کو"لغت" اور گریمر کو"قواعد" کہتے ہیں۔لیکن یہ الفاظ مولانا کے زمانے میں بہت رائج نہ تھے،یا اگر تھے تو ان معنی میں نہ تھے جن معنی میں ہم انھیں سمجھتے ہیں۔پھر یہ بات بھی ہے کہ اس زمانے کے بہت سے اردو ادیبوں کی طرح مولانا بھی اسی خیال کے تھے کہ انگریزی الفاظ (Literature, Dictionary, Grammar) وغیرہ جن تصورات کے حامل ہیں وہ تصورات اردو لفظوں سے نہیں حاصل ہو سکتے۔بہرحال،ہم لوگوں کو اردو میں انگریزی الفاظ کے استعمال سے،جہاں تک ممکن ہو،پرہیز کرنا چاہیے۔سرسید احمد خاں،مولانا حالی،مولانا محمد حسین آزاد وغیرہ کے زمانے میں ہندوستانی معاشرے میں نئی باتیں بکثرت اور بہت تیزی سے شامل ہو رہی تھیں۔اس لیے اس وقت انگریزی الفاظ بھی کثرت سے لائے جا رہے تھے۔آج ہمارے سماج میں وہ صورت حال نہیں ہے جو سرسید وغیرہ کے زمانے میں تھی۔آج تو بہت سے لوگ اردو کے اچھے اور آسان لفظ چھوڑ کر انگریزی یا ہندی کے لفظ بے تکلف لکھ بول رہے ہیں۔یہ بات زبان کے لیے بے حد نقصان دہ ہے۔حالی نے اپنے وقت کے دلی اور لکھنؤ کے اردو والوں سے کہا تھا کہ وہ اپنی زبان کی حفاظت کریں ورنہ بہت نقصان اٹھائیں

گے۔حالی کی یہ تنبیہ آج بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی آج سے سو، سوا سو برس پہلے تھی۔
حالی نے ''اتباع'' کو مذکر لکھا ہے۔آج کل اسے عام طور پر مونث بولتے ہیں۔

فرہنگ

تمام اطراف میں =	Everywhere; this word is the plural of طرف which means, direction, side,	हर स्थान पर, हर ओर। 'अतराफ़' बहुवचन है 'तरफ़' का। 'तरफ़' के मायने हैं ओर, दिशा, किनारा।
شائع ہونا =	To be published	समान्यत: 'फैलना'। आजकल यह छपने या प्रकाशित होने के अर्थ में प्रयुक्त होता है।
جامع =	Comprehensive	व्यापक। ऐसी रचना जिसमें अमुक विषय के सभी पहलुओं को समेट लिया गया हो।
جوانب =	Plural of جانب;direction, side	'जानिब' का बहुवचन। अर्थात दिशाएं, किनारे
اشاعت ہونا =	To be published; اشاعت ہونا and شائع ہونا have almost the same meaning	प्रकाशित होना। प्रकाशन। 'शाया होना' और 'इशाअत होना' का लगभग एक ही अर्थ है।
اتباع کرنا =	To model oneself on something; to imitate or follow	पदचिन्हों पर चलना।

تالیف=	To compile; compilation	संकलन करना। अर्थात कोई पुस्तक लिखना या लेख लिखना, और इस तरह लिखी हुई रचनाओं का संग्रह तैयार करना।
تصنیف=	To write, or be author of something; something written by an author or writer	मौलिक रचना। ऐसा लेख या पुस्तक जिसमें लेखक ने अधिकतर अपने ही विचार व्यक्त किए हों।
روزمره=	Idiomatic standard speech; Any part or word of such speech	सामान्य बोलचाल की मानक भाषा, मुहावरे दार भाषा, इस भाषा का कोई शब्द, या वाक्य।
وسائل=	Plural of وسیلہ, means	'वसीला' का बहुवचन। साधन
مذاق=	Taste, liking	रूचि, झुकाव, पसंद
مابہ الامتیاز=	The reason for the distinction or preference or liking for something among other things	किसी वस्तु या रचना को पसंद करने के आयाम। वह बात जो इस पसंद, विशिष्टता या विशेषता की नींव हो।

اردو ادب وسط انیسویں صدی تک

سید احتشام حسین

تیرہویں صدی کے اختتام تک بابا فرید گنج شکر اور ہمہ گیر شاعر امیر خسرو کی نظمیں اردو ادب کی داغ بیل ڈال چکی تھیں۔ امیر خسرو کی زبان دہلی کے قرب و جوار کی بولی کا ایک نیا روپ تھی۔ انھوں نے اس بولی کو دہلوی کا نام دیا۔ لیکن بعد میں اس کا نام کھڑی بولی پڑ گیا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ جنوبی ہند کے دہلی راج کے تحت چلے جانے سے دہلی کے راج دربار سے فوجی، صوفی، فقیر، تاجر اور آفیسر وہاں گئے اور شمالی ہندوستان کی بول چال کی زبان بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ کئی تاریخی قوتوں نے دہلی کے علاقے میں بولی جانے والی زبان کا مرکز جنوبی ہند کو بنا دیا۔ آہستہ آہستہ یہ دکن اور گجرات میں پھیل گئی۔ شمال میں یہ صرف بول چال کی زبان رہی لیکن جنوب میں اس کا ادبی روپ نکھرنے لگا اور اسے مختلف نام مثلاً ہندی، ہندوی، دکھنی اور گجری وغیرہ دیے گئے۔ بہمنی سلطنت اور بعد میں گول کنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں میں اس کی خوب نشو و نما ہوئی۔ صوفی امن و عبادت کا پیغام عام فہم زبان میں دیتے تھے۔ بادشاہ اس کی سرپرستی کرتے تھے اور اس زبان میں نظمیں کہتے تھے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ قدیم اردو دکن میں بہت مقبول ہوئی اور دہلی کے مشہور صوفی بزرگ خواجہ گیسو

دراز نے، جوگلبرگہ چلے گئے تھے 1420 سے قبل، تصوف پر اپنا مشہور رسالہ ''معراج العاشقین'' لکھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بیجا پور، گول کنڈہ اور احمد نگر میں صوفیوں نے پندرہویں اور سولہویں صدی میں صوفیانہ نظمیں اور کتابیں لکھیں۔ یہ سب کچھ شمال میں اردو کی جائے پیدائش سے بہت دور مقامات پر ہو رہا تھا۔

دکھنی اردو نے 1600 کے قریب بیجا پور اور گول کنڈہ میں خوب ترقی کی۔ بیجا پور کے ابراہیم عادل شاہ نے 1599 کے لگ بھگ اپنا مجموعۂ کلام ''نورس'' تیار کیا۔ انھیں نہ صرف قدیم اردو بلکہ برج بھاشا پر بھی دسترس تھی۔ یہ کتاب ہندوستانی موسیقی کی بہترین روایات سے خوشہ چینی کرتی ہے۔ ان کے دور میں فارسی زبان کے عالموں اور شاعروں کے علاوہ اردو کے شاعروں مثلاً مقیمی اور امین نے خوب ترقی کی۔ بعد میں بیجا پور میں بہت سے اردو شاعر ہوئے جن میں ہاشمی، رستمی اور نصرتی کے نام اہم ہیں۔ گول کنڈہ میں بھی حالات اس سے مختلف نہ تھے۔ وہاں محمد قلی قطب شاہ نے، جنھوں نے 1611 تک حکومت کی، ایک لاکھ سے زیادہ شعر کہے جن میں انھوں نے اپنے مذہبی اور روحانی حالات کا اظہار کیا۔ ان کی نظموں میں ہمیں ایک حقیقی ہندوستانی بادشاہ کے دل کی دھڑکنوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ انھیں ہندوستان کے موسم، پھول پھل اور تیوہار جیسے بسنت، ہولی اور دیوالی بہت پسند تھے۔ ان کے دربار میں اردو کے کئی اچھے شاعر موجود تھے۔ جن میں ملا وجہی کا نام، جنھیں نظم اور نثر دونوں پر عبور حاصل تھا، درخشاں ہے۔ ان کی نثر کی کتاب ''سب رس'' اور نظم ''قطب مشتری'' کے مقابلے میں کتابیں آج بھی نہیں ملتیں۔ محمد قلی قطب شاہ کے بھتیجے عبداللہ، ان کے پوتے محمد اور محمد کے صاحبزادے ابوالحسن اچھے شاعر تھے اور شاہی خاندان کے باہر غواصی اور ابن نشاطی جیسے اعلیٰ شاعر ہوئے۔

سنہ 1687 میں اورنگ زیب نے دکن کی سلطنتوں کو ختم کر دیا۔ لیکن ادبی ترقی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس وقت تک اردو میں نہ صرف اعلیٰ درجے کی صوفیانہ اور مذہبی شاعری تھی بلکہ ''نورس''، محمد قلی قطب شاہ کی تصانیف، ''سب رس''، ''قطب مشتری''، ''پھول بن''، ''سیف الملوک''، ''طوطی نامہ''، ''علی نامہ''، ''گلشن عشق'' اور ''یوسف زلیخا'' جیسی بلند پایہ غیر مذہبی کتابیں بھی لکھی جا چکی تھیں۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں جب کہ ولی دکنی کا طوطی بول رہا تھا، شمالی ہند میں بھی اس زبان میں شعر و شاعری ہونے لگی جو کہ پانچ سو سال سے وہاں نشو و نما پا رہی تھی۔ فارسی کا طلسم ٹوٹ رہا تھا اور ایسا وقت آنے لگا تھا جب کہ شاعر محسوس کرنے لگے کہ انھیں عام بول چال کی زبان میں اپنے ادبی خیالات کا اظہار کرنا چاہیے۔ دکن کے شاعروں کی مثال اردو میں شعر کہنے کے لیے ان کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ اردو شاعری کا مرکز جنوبی ہند کے بجائے شمالی ہندوستان بن گیا۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ جس وقت دہلی کی اہمیت بڑھ رہی تھی، اس وقت بھی دکن میں ولی، بحری اور سراج جیسے عظیم شاعر موجود تھے اور صوفیانہ اور عشقیہ اور بیانیہ شاعری میں ان کی کامیابیوں کا شمالی ہندوستان میں اردو شاعری پر گہرا اثر پڑا۔

دہلی کے ابتدائی دور میں جان جاناں، خان آرزو، فائز، آبرو، ناجی، مظہر، یک رنگ، انجام اور مضمون کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں آرزو، مظہر اور فائز نئے مکتب خیال کے روح و رواں تھے۔ نادر شاہ کے ہاتھوں دہلی کی لوٹ کھسوٹ کے باجود شاعروں کی پوری نسل وہاں مقیم رہی اور انھوں نے ہندوستان میں پھیلتی ہوئی زبان کو مالا مال کیا۔ جاگیردارانہ دور ختم ہو رہا تھا اور مغلوں کی عظیم سلطنت چھوٹی چھوٹی نیم آزاد ریاستوں میں بٹ رہی تھی۔ اس صورت حال نے ان شاعروں کو،

جنھیں تاریخ کے دھارے کا علم نہیں تھا، الجھن میں ڈال دیا۔ اس لیے اس دور کی تخلیقی نگارشات میں الم ناک خلوص جھلکتا ہے۔ دہلی کے مکتب خیال کے ابتدائی دور میں یہ شاعر اہم تھے لیکن اسی دور میں اردو کے عظیم ترین شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے کئی ادبی اصناف کی نشو ونما کر کے اردو ادب کے دامن کو وسیع کیا۔ وہ ہیں خواجہ میر درد، مرزا محمد رفیع سودا اور میر تقی میر۔

اردو کے صوفی شعرا میں سب سے زیادہ اہم شاعر خواجہ میر درد نے زیادہ تر غزلیں کہیں۔ انھیں زبان پر کامل عبور حاصل تھا۔ سودا کو کئی اصناف پر عبور حاصل تھا۔ وہ اردو کے ہمہ گیر شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا شمار اب بھی بہترین طنز نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ افراد، سماجی افراتفری، اور اخلاقی بے راہ روی پر بھرپور طنز کرتے ہیں۔ انھوں نے مرثیے کو بھی ادب کا ایک حصہ بنا دیا۔ اس طرح سودا کا مقابلہ فارسی کے بڑے شاعروں سے بہ آسانی کیا جا سکتا ہے جنھوں نے کچھ اصناف میں مشعل راہ کا کام کیا۔

میر تقی میر کا تعلق اکبر آباد کے ایک عالم صوفی خاندان سے تھا۔ بچپن سے ہی ان پر صوفیوں کی انسان دوستی اور عقیدے کی پابندیوں سے آزاد رہنے کی روایات کا گہرا اثر تھا۔ ابھی وہ گیارہ سال کے ہی تھے کہ ان کے والد وفات پا گئے اور انھیں سوتیلے بھائیوں اور رشتے داروں سے ٹھوکریں کھانے کے لیے تنہا چھوڑ گئے۔ اس لیے انھوں نے مشکلات کی گود ہی میں تعلیم و تربیت پائی۔ جو کوئی بھی تنقیدی نگاہ سے ان کی شاعری پڑھے گا وہ اس میں انسان کی مشکلات کو سر کرنے کے لیے جد و جہد اور ناکامی کے جذبات کو بھانپ لے گا۔ میر نے اپنی نظموں میں انسان کے ظلم اور قدرت کی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان کی شاعری کا بہترین حصہ غزلیں

ہیں جن میں مٹھاس، خلوص، فن، اور تاثیر کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ فارسی تصانیف کے علاوہ ان کے خودنوشت سوانح حیات اور اردو کلام کے چھ دیوان ہیں۔

اس وقت تک دہلی کی سلطنت کا شیرازہ بھی بکھر گیا تھا اور بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن گئی تھیں جن کے والیان عالموں، شاعروں اور فن کاروں کی سرپرستی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ ان ریاستوں میں فرخ آباد، ٹانڈہ (ضلع بریلی)، اودھ، عظیم آباد (پٹنہ)، حیدرآباد اور بعد میں رام پور کے نام قابل ذکر ہیں۔

دہلی میں حالات خراب ہو جانے کی وجہ سے کچھ شاعروں نے دوسرے مقامات کا رخ کیا۔ فغاں، میر ضاحک، سودا، میر سوز، میر اور چند سال بعد مصحفی، جرأت اور انشا لکھنؤ گئے اور وہاں انھیں بہت عزت ملی۔ ان شاعروں کے لکھنؤ چلے جانے سے وہاں علم و ادب کا ایک نیا مرکز بن گیا۔ انشا (جنھیں زبانوں اور ادبی روایات کا علم تھا) کی شاعری میں نادر نمونے ملتے ہیں۔ مصحفی بھی بہت بڑے عالم تھے اور انھوں نے تنگ دستی اور غربت کے باجود آٹھ شعری مجموعے لکھے۔ انشا پہلے عالم تھے جنھوں نے اردو زبان کی لسانی خوبیوں اور ادائیگی کی خصوصیتوں پر فارسی زبان میں ''دریائے لطافت'' نام کی کتاب لکھی۔ اسی زمانے میں میر ضاحک کے بیٹے میر حسن کا خوب بول بالا تھا۔ انھوں نے بیانیہ نظموں اور غزلوں کے مجموعوں کے علاوہ بہترین اردو مثنوی ''سحر البیان'' لکھی۔

لکھنؤ کے مکتبۂ خیال کے نئے شاعروں کے تذکرے سے پیشتر عوام کے عظیم شاعر نظیر اکبرآبادی کا ذکر ضروری ہے، جن کی شاعری میں ہندوستان کی روزمرہ کی زندگی کی جھلکیاں دکھائی اور دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ حیدرآباد، بھرت پور اور

اودھ کے شاہی درباروں کے دعوت ناموں کوٹھکرا کر نظیر نے ایک معمولی معلم کی حیثیت سے آگرے کے لوگوں کے درمیان رہنا ہی گوارا کیا۔ نظیر آدرش وادی نہیں تھے۔ ہمیشہ ان کی نظر زندگی کی حقیقتوں پر رہتی تھی۔ انھوں نے عام لوگوں کے مسائل بھوک، عشق، اور اقتصادی ضروریات وغیرہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ وہ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے تیوہاروں میں دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔ انھوں نے کرشن جی، مہادیو جی، نرسی بھگت اور گرونانک پر درجنوں نظمیں کہی ہیں۔ ان کی زبان لکھنؤ اور دہلی کے شاعروں کی زبان کی طرح شستہ نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ان کے موضوعات اور زبان میں مطابقت ضرور تھی۔ ان کی زبان عوام کے ذوق کی کسوٹی پر پوری اترتی تھی۔

اب تک لکھنؤ، ادب کا اہم مرکز بن چکا تھا اور ناسخ و آتش لکھنؤ کے اس دور کے مشہور ترین شاعر تھے۔ زبان اور علم عروض پر عبور حاصل ہونے سے ناسخ کی ادب کے میدان میں ڈکٹیٹر کی سی حیثیت تھی اور انھوں نے دہلی کے شاعروں پر بھی اثر ڈالا۔ اس دور کی بہترین تخلیقات میں سے آتش کے شاگرد پنڈت دیا شنکر نسیم کی ''مثنوی گلزار نسیم'' ہے۔ جنھوں نے لکھنؤ کے طرز بیان اور محاورے کو فنکارانہ چابک دستی سے استعمال کیا۔

لکھنؤ کی کامیابیوں کا بیان نامکمل رہ جائے گا اگر انیسویں صدی کے وسط کے دو عظیم مرثیہ گو شاعروں میر انیس اور مرزا دبیر کا ذکر نہ کیا جائے۔ میر انیس نے زبان پر عبور، تخیل کی بلند پروازی اور وسیع علم کو مرثیہ نگاری میں خوب استعمال کیا اور ان کے مرثیوں میں رزمیہ اور المیہ کا عجیب امتزاج ملتا ہے۔ مرزا دبیر جو کہ اتنے ہی مشہور تھے، ان کی بلندیوں کو نہ چھو سکے۔

امانت کی ''اندر سبھا'' نے اوپیرا کی صورت میں شاعری میں اضافے کیے۔ اگرچہ لکھنؤ کی شان وشوکت نے کچھ عرصے کے لیے دہلی کو پس پشت ڈال دیا تھا لیکن 1857 کے انقلاب میں تباہ و برباد ہونے سے پہلے دہلی نے اردو کے عظیم ترین شاعروں میں چند کو جنم دیا۔ ذوق، مومن، بہادر شاہ ظفر، شیفتہ اور غالب تمام اسی دور کے ہیں۔ یہاں ان تمام شعرا کی کامیابیوں پر تفصیل سے بحث کرنا ممکن نہیں، لیکن پھر بھی اردو شاعری کے سب سے بیش بہا اور تاب ناک موتی مرزا غالب کا ذکر ضروری ہے۔ انسان کے دل کی گہرائیوں پر نظر، اس کے مسائل کے متعلق فلسفیانہ رویے، زندگی اور موت کے اسرار کے علم اور خیالات کو چابکدستی سے فن کا جامہ پہنانے کی صلاحیت کی وجہ سے وہ اردو ادب کے عظیم ترین شاعر ہیں۔

انیسویں صدی کے وسط میں اردو ادب کا جدید دور شروع ہونے سے پیشتر اردو شاعری میں غزل، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ جیسے کلاسیکی اصناف میں کمال حاصل کیا جا چکا تھا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اردو نثر کی پہلی کتاب پندرہویں صدی میں خواجہ گیسودراز کی تصنیف ''معراج العاشقین'' تھی۔ بعد میں دکن میں اردو نثر کی اور کئی کتابیں لکھی گئیں جن میں ملا وجہی کی تصنیف اعلیٰ ترین مانی جاتی ہے۔ قدرتی طور پر ابتدا کی زیادہ تر تصانیف مذہبی تھیں لیکن 1775 کے آس پاس اٹاوہ کے میر حسین عطا تحسین نے ''نوطرز مرصع'' نام کی کتاب لکھی۔ اس کتاب میں فارسی کی کتاب سے ماخوذ چہار درویش کا قصہ بیان کیا گیا تھا۔ اسی اثنا میں عیسائی مشنریوں، یورپی تاجروں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں نے اردو کی گرامر پڑھ لی تھی۔ انھوں نے اس زبان کو انڈک، انڈوستانی یا ہندوستانی کا نام دیا اور وہ اسے ہندوستان کی

عوامی زبان سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس زبان کے متعلق کچھ کتابیں لکھیں اور اسے مقبول بنانے کی کوشش کی۔

انگریزوں نے سمجھ لیا تھا کہ اس وسیع ملک کی زبان سیکھے بغیر گذارہ کرنا مشکل ہے اور اپنے افسروں کو اردو پڑھانے کے لیے انھوں نے 1800 میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ اس کالج نے اپنے قیام کے پہلے دس سال میں اردو کی کچھ اہم کتابیں شائع کیں۔ اگر چہ اس کالج سے عام لوگوں کا کوئی تعلق نہ تھا لیکن پھر بھی اس کے اثرات اور زبان میں اضافے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ میر امن کی ''باغ و بہار''، شیر علی افسوس کی ''آرائش محفل''، حیدر بخش حیدری کی ''حاتم طائی''، کاظم علی جوان کی ''سنگھاسن بتیسی'' اور ''شکنتلا'' اور نہال چند کی ''مذہب عشق'' وغیرہ آج بھی اردو ادب کے خزانے میں بیش بہا موتی ہیں۔

انشا نے، جن کا ذکر پہلے بطور شاعر کیا جاچکا ہے، ہندوستانی نثر میں ایک کتاب ''رانی کیتکی کی کہانی'' لکھی، جس میں عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ اس کتاب پر ہندی اور اردو دونوں زبانیں اپنا حق جتاتی ہیں۔ انیسویں صدی کے پہلے تیس سال میں چھاپے خانے قائم ہوجانے کی وجہ سے اردو نثر نے کافی ترقی کی۔ 1824 میں رجب علی بیگ سرور نے اردو نثر کی مشہور ترین کتابوں میں سے ایک کتاب ''فسانۂ عجائب'' مرصع طرز پر لکھی۔ اسے اردو نثر میں لکھنؤ کا پہلا قابل قدر اضافہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے پس منظر میں لکھنؤ کے اس دور کی زندگی نمایاں ہے اور اس کتاب کی سماجی افادیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

مرزا غالب نے وفات پانے سے قبل بیس سال تک شستہ اور خوبصورت نثر لکھی۔ دوستوں، شاگردوں، مداحوں اور سرپرستوں کو لکھے ہوئے ان کے خطوط میں

مختلف ادبی، فلسفیانہ، مذہبی، سماجی اور تاریخی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ کچھ نقاد انھیں جدید اردو نثر کا پیش رو مانتے ہیں۔

اس مختصر بیان سے ظاہر ہے کہ قدیم اردو نثر میں مغربی ٹکنیک کے مطابق لکھے ہوئے ڈرامے، ناول اور افسانے کے علاوہ ادب اور علم کے ہر شعبہ پر تصانیف موجود ہیں۔ جہاں تک سائنٹفک نثر کا تعلق ہے، 1844 میں قائم شدہ دہلی کالج کی ورنا کیولر ٹرانسلیشن (Vernacular Translation Society) سوسائٹی نے سائنس، علم ریاضی، قانون، تاریخ اور جغرافیہ پر ایک سو پچاس سے زیادہ کتابیں شائع کیں۔ اردو ادب کے جدید دور کے آغاز سے قبل اردو ادب تاریخ کے دھارے کے زیر اثر ترقی پذیر رہا۔ اس دور کے اردو ادب میں انسان کی اخلاقی اصلاح، انسانیت کی وحدت اور علم کی ترویج پر زور دیا گیا۔ ❀❀

غور کرنے کی بات

سید احتشام حسین (1912 تا 1972) ہمارے زمانے میں اردو کے عظیم ترین ادیبوں میں سے تھے۔ یوں تو انھوں نے افسانے بھی لکھے، شعر بھی کہے، لسانیات پر بھی کام کیا اور ترجمے بھی کیے، لیکن ان کی بنیادی حیثیت ایسے نقاد کی ہے جس نے اردو میں ترقی پسند ادب کی بنیادیں مضبوط کیں اور تنقید کو نئی بلندیوں تک پہنچایا۔ ان کا یہ مضمون ہمیں اردو زبان اور ادب کی عہد بہ عہد ترقی اور اپنے زمانے کے سماجی اور سیاسی حالات سے اردو ادب کے تعلق کے بارے میں آسان زبان میں بتاتا ہے۔

''آفیسر'' انگریزی لفظ Officer کا اردو روپ ہے۔ اردو میں عام طور پر ''افسر'' رائج ہے لیکن احتشام صاحب نے ''آفیسر'' لکھا ہے جو ایک زمانے میں مشرقی یو۔ پی۔ میں رائج تھا۔

احتشام صاحب نے ''تاریخی قوتوں'' اور پھر ''تاریخ کے دھارے'' کا ذکر کیا ہے۔ یہ مارکسی یا ترقی پسند فکر کی لائی ہوئی اصطلاحیں ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ انسانی معاملات میں

تاریخ ایک بڑی حد تک خود کارعمل ہے۔ تاریخ ایک قوت ہے جو انسانی معاملات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ تاریخ کے عمل کے ذریعہ انسانی سماج اور سیاست میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔

''نشو ونما'' میں دونوں نون پر زبر ہے۔ ان دونوں لفظوں کے معنی ایک ہیں لیکن اردو میں دونوں ایک ساتھ مع واؤ بولے جاتے ہیں۔ نہ ''نشو'' کو اکیلے بولتے ہیں اور نہ ''نما'' کو۔ ''نشو ونما'' پہلے زمانے میں مذکر تھا لیکن اب عام طور پر اسے مونث بولتے ہیں، جیسا کہ احتشام صاحب نے لکھا ہے۔

''سوانح'' جمع ہے ''سانحہ'' کی، بمعنی ''واقعہ، خاص کر تکلیف دہ یا رنجیدہ کرنے والا واقعہ''۔ تنہا ''سوانح'' کو مذکر بولتے ہیں لیکن آتم کتھا (Autobiography) کے معنی میں ''سوانح حیات'' کو مونث بولتے ہیں۔

احتشام صاحب نے ''لکھنؤ کے مکتبۂ خیال'' کا ذکر کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اردو شاعری کے دو بڑے مرکز دہلی اور لکھنؤ تھے، اور ان کی شاعری میں اتنا فرق ہے کہ اس کی بنا پر لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کو الگ الگ ''مکتب'' یا School قرار دینا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ شاعری کے بارے میں ان کے خیالات اور عمل بالکل الگ الگ طرح کے تھے۔ اب یہ خیال کچھ بہت زیادہ مقبول نہیں ہے۔

''نشو ونما'' کی طرح کا لفظ ''روح و رواں'' بھی ہے۔ دونوں کے معنی ''روح''، یا ''جان'' کے ہیں۔ لیکن دونوں ایک ساتھ ملا کر ''روح/ جان'' کے معنی میں بولے جاتے ہیں اس موقعے پر، جہاں کسی شخص کے بارے میں کہنا ہو کہ کسی کام یا چیز کو قائم کرنے اور چلانے میں اس شخص نے بہت اہم کام کیے ہیں۔ ''روح'' کو الگ بھی بولتے ہیں، لیکن ''رواں'' بمعنی ''روح/ جان'' کو الگ سے نہیں بولتے۔ ''نشو ونما'' کی طرح یہاں بھی دونوں الفاظ کو جوڑنے کے لیے واؤ لگاتے ہیں۔ ایسے واؤ کو ''واؤ عطف'' یا ''واؤ عاطفہ'' کہتے ہیں۔

انگریزی زبان میں Vernacular ایسی زبان کو کہتے ہیں جو مقامی ہو، ترقی یافتہ نہ ہو اور غیر علمی ہو۔ یہ انگریزوں کا تعصب تھا جس کی بنا پر انھوں نے ہندوستانی زبانوں کو Vernacular کا خطاب عطا کیا۔

احتشام صاحب نے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (وفات 1422) کا ذکر کیا ہے کہ وہ ''معراج العاشقین'' کے مصنف تھے۔ ایک زمانے تک سب لوگ اسی خیال کے تھے، لیکن اب عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ''معراج العاشقین'' حضرت خواجہ بندہ نواز کی تصنیف نہیں ہے۔

فرہنگ

طوطی بولنا (کسی کا) =	For someone to be extremely popular or influential	बहुत लोकप्रिय होना, बहुत प्रभाव शाली होना।
بیانیہ =	Narrative	वृतान्त। ऐसी रचना (गद्य या पद्य) जिसमें किसी घटना या दृष्य इत्यादि का वर्णन हो!
ہمہ گیر =	Covering many subjects or having many specialities	कई विशेषताऐं रखने वाला, बहुत से विषयों को समाहित करने वाला, कई चीज़ों पर फैला हुआ!
نشو ونما =	Development; growth	बढ़ोत्तरी, विकास
خوشہ چینی کرنا =	To derive benefit or influence	दूसरों से लाभान्वित होना, लेखन में किसी दूसरे के विचारों से फ़ायदा उठाना।

طلسم =	Magic; a magical construct, especially a place; طلسم ٹوٹنا means for something to lose its power or influence	जादू, जादू से बनी कोई वस्तु। 'तिलिस्म टूटना' का अर्थ है किसी का प्रभाव समाप्त हो जाना।
عروض =	Prosody; in Hindi, it's called Pingal	छन्द शास्त्र, पिंगल।
ڈکٹیٹر =	Dictator	अधिनायक, सब पर हुक्म चलाने वाला।
رزمیہ =	Epic; Epic poem	महाकाव्य, वीरगाथा, ऐसी कविता जिसमें युद्धों और विजयों का वर्णन हो।
المیہ =	Tragedy; A tragic poem or play	दुखान्त, ऐसी रचना या नाटक जिसका अन्त दुखद हो।
اوپیرا =	Opera	ऐसी नाटक रचना जिसमें संगीत पर अधिक ज़ोर हो और जिसके संवाद गीतों के रूप में हों। औपेरा।

مسجع = Rhymed prose; A verse each of whose parts is equal in weight — ऐसी गद्य रचना जिसमें वाक्यांश समान भार रखते हों। वे तुकान्त भी हो सकते हैं।

اچھی چیز سے نقصان نہیں

افلاطون، ترجمہ: ڈاکٹر ذاکر حسین

سقراط:

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے محافظ آپس میں لڑنے جھگڑنے کو بدترین عادت مانیں، تو ہمارا فرض ہے کہ انھیں آسمانی جنگوں کے متعلق ایک حرف بھی نہ سننے دیں، نہ ان سازشوں اور باہمی جھگڑوں کا ذرا بھی ذکر ان سے کرنا چاہئے جو دیوتاؤں کے درمیان بتلائے جاتے ہیں، کیونکہ یہ تمام روایتیں سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں۔ نہ ہم کو ان روایتوں کا ذکر کرنا چاہئیے جن میں دیوتاؤں کی آپس کی معرکہ آرائی کے حال بیان کیے جاتے ہیں اور نہ کپڑوں پر ان معرکوں کے کشیدے کاڑھنے کی اجازت دینی چاہیے۔ پھر، ان دوسرے بے شمار جھگڑوں کے متعلق بھی ہمیں خاموشی اختیار کرنی چاہیے جو دیوتاؤں، سورماؤں، یا ان کے عزیزوں میں ہوئے۔ اگر یہ لوگ باور کرلیں تو ہم تو یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ جنگ وجدال سخت ناپاک کام ہے اور آج تک اچھے شہریوں میں کبھی جھگڑا فساد نہیں ہوا۔ بچپن ہی سے ان بچوں کے سامنے بوڑھوں اور بوڑھیوں کو ان باتوں پر زور دینا چاہیے اور اس کے بعد جب یہ ذرا بڑے ہو جائیں تو شاعروں کو ایسے خیالات نظم کر کے ان کے سامنے پیش کرنا چاہئیں۔ مگر اس قسم کے بیانات کہ ہیفیسٹس نے اپنی ماں ہیری کو باندھ کر

ڈال دیا تھا، یا دوسرے موقعے پر زئیس نے اسے اس قصور پر نکال دیا تھا کہ مار پڑتے وقت اس نے ماں کی طرفداری کی تھی، ہم ہرگز اپنی ریاست میں روا نہ رکھیں گے، خواہ شاعر نے انھیں تمثیل اور استعارے کے طور پر ہی استعمال کیا ہو، کیونکہ ایک کمسن آدمی یہ تمیز نہیں کرسکتا کہ اس سے لفظی معنی مراد ہیں یا محض تمثیل۔ اور اس عمر میں ذہن کی حالت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ جس چیز کا اثر پڑ جاتا ہے، پتھر کی لکیر بن جاتا ہے۔ اور اسی لیے یہ بات اور بھی ضروری ہے کہ بچپن میں جو قصے کہانیاں سنائی جائیں وہ پاک خیالوں کا نمونہ ہوں۔

ایڈیمینٹس:

جناب کا یہ فرمانا تو بالکل درست ہے لیکن یہ کہیئے کہ اگر کوئی آپ سے پوچھ بیٹھے کہ اس قسم کی کہانیاں ملیں گی کہاں سے، تو آپ کے پاس کیا جواب ہے؟

سقراط:

برادر عزیز، تم اور میں ایک شاعر کی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ہم تو ایک ریاست کا اساسی نظام مرتب کر رہے ہیں۔ اور ریاست کے بانیوں کا کام بس اتنا ہے کہ شاعروں کو وہ طرز بتلا دیں جس پر قصے لکھنا چاہییں۔ نیز انھیں ان کی حدود سے آگاہ کر دیں۔ ان کے ذمہ یہ کام ہرگز نہیں آتا کہ وہ خود ہی یہ قصے اور کہانیاں بنا بھی ڈالیں۔

ایڈیمینٹس:

لیکن آخر یہ طرز کیا ہونا چاہیے؟

سقراط:

شاعروں کو ہر قسم کی نظم میں اس امر کا خاص التزام رکھنا چاہیے کہ خدا کو بالکل

حقیقت کے مطابق ظاہر کریں۔اس میں مثنوی، غزل یا مرثیے کی کوئی قید نہیں۔

ایڈیمینٹس:

خوب۔

سقراط:

اور خدا فی الحقیقت خیر و برکت ہے۔اس کے اچھے ہونے سے کیسے انکار ہو سکتا ہے؟اس لیے نظم میں بھی اس کی یہی حقیقت پیش کرنی چاہیے۔

ایڈیمینٹس:

بے شک۔

سقراط:

اور یہ بات ظاہر ہے کہ اچھی چیز نقصان دہ نہیں ہوتی۔

ایڈیمینٹس:

بلاشبہ۔

سقراط:

اور نقصان دہ نہ ہونے کے یہی معنی تو ہیں کہ کسی کو اس سے ضرر نہیں پہنچتا۔

ایڈیمینٹس:

اور کیا۔

سقراط:

اور جس چیز سے کوئی ضرر یا نقصان نہیں پہنچتا وہ برائی کا سبب کیونکر ہو سکتی ہے؟

ایڈیمینٹس:

ناممکن!

سقراط:

اورآپ غالباً یہ بھی تسلیم کریں گے کہ اچھی چیز فائدہ رساں ہوتی ہے؟

ایڈیمینٹس:

بےشک۔

سقراط:

اس تمام تقریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ خیر اور اچھائی صرف خیر کا سبب ہو سکتی ہے۔ اسے آپ ہر چیز کی وجہ نہیں قرار دے سکتے۔ ❀❀

غور کرنے کی بات

یونانی فلسفی افلاطون (429 قبل حالی تا347 قبل حالی) کو دنیا کا سب سے بڑا فلسفی کہا جاسکتا ہے۔ اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ فلسفہ کے جتنے سوالات ممکن ہیں وہ سب افلاطون کے یہاں کسی نہ کسی صورت میں مل جاتے ہیں۔ہم نے یہ اقتباس اس کی کتاب The Republic سے لیا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے انگریزی اور جرمن تراجم کو سامنے رکھ کر کیا ہے اور اس خوبی سے کہ افلاطون کی نثر کی شان ترجمے میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔ افلاطون کا طریق کار یہ تھا کہ وہ رسمی کتاب یا مضمون کی جگہ مکالمے لکھتا تھا جن میں اس کے استاد سقراط سے کوئی شخص، عموماً افلاطون کا بھائی گلاکن (Glaucon) یا اس کا دوسرا بھائی ایڈیمینٹس (Aidementus)، کچھ سوال اٹھاتا ہے اور سقراط ان سوالوں کا جواب کچھ اس انداز سے دیتا ہے کہ سوال کرنے والے کی بات ہی سے اس کا جواب نکل آتا ہے۔

زیرنظر مکالمے میں افلاطون یہ بتا رہا ہے کہ شاعری، دیوتاؤں کے افسانے، اور ان افسانوں پر مبنی تحریریں نقصان دہ ہیں کیوں کہ ان کے ذریعہ انسانوں میں لڑائی جھگڑے اور بے ایمانی یا وعدہ خلافی کرنے کی عادتیں پیدا ہوتی ہیں۔ شاعری نقصان دہ ہے کیونکہ وہ خدا کو اس کی

اصل صورت یعنی ''خیر و برکت'' کے روپ میں نہیں پیش کرتی۔ اور اگر خراب چیز نقصان پہنچاتی ہے تو ظاہر ہے کہ اچھی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین (1897 تا 1969) مشہور قومی رہنما اور ماہر تعلیم تھے۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بنیاد گذاروں میں تھے۔ بعد میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ پھر بہار کے گورنر، ہندوستان کے نائب صدر اور پھر ہندوستان کے صدر بنے۔ اسی عہدے پر کام کرتے ہوئے ان کا انتقال ہوا۔ ذاکر حسین نے بچوں کے لیے بھی بہت کچھ لکھا ہے اور ان کا ترجمہ ''ریاست'' اردو کے بہترین تراجم میں شمار کیا جاتا ہے۔

فرھنگ

محافظ =	Plato divided the people into three categories: The Philosopher-King, the Protectors (that is, the Army), and the common people.	रक्षक सैनिक। अफ़लातून ने लोगों को तीन वर्गों में बांटा था: दार्शनिक, रक्षक और जनसाधारण।
کپڑوں پر کشیدہ کاڑھنا =	Tapestry	पर्दों, दीवार–दरी, चादरों इत्यादि पर युद्ध के दृश्य, देवी–देवताओं के वृतान्त पर आधारित दृश्य काढ़े जाते थे।
باور کرنا =	To believe	विश्वास करना

تمثیل = Allegory
अन्योक्ति, दृष्टान्त, प्रतीक या रूपक कथा। कोई ऐसी कथा या वृतान्त जिसमें चीज़ों को वास्तविक रूप की जगह किसी दूसरे रूप में प्रस्तुत किया जाता है। उदाहरणार्थ, किसी बुद्धिमान पात्र का नाम 'बुद्धि' रखदें और उसकी हर बात विवेकपूर्ण दिखाएं।

ہیفیسٹس = Son of Zeus, the god of iron and iron-working, he lives in Hades
हेफ़ेइस्टस। यूनानी देवमाला में देवराज ज़ियूस (zeus) का बेटा, जो लौह और लौह निर्मित वस्तुओं का देवता है। यह हेडीज़ (पाताल) में रहता है।

ہیری = The wife of Zeus; she is also called Hera
ज़्यूस देवता की पत्नी। इसे हीरा भी कहते हैं।

زیئس =	The most powerful of the Greek Gods; he is also called Zee-eus	ज़ियस / ज़ियूस यूनानी देवमाला का सबसे बड़ा देवता।
اساسی =	Fundamental, basic	बुनियादी, आधार से सम्बन्धित, मूल भूत।
نظام =	Constitution	व्यवस्था, राज्य–व्यवस्था, संविधान
التزام =	To regard as essential	अत्यावश्यक समझना, प्रधानता देना।

چکبست لکھنوی

آل احمد سرور

چکبست 1882 میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ بزرگوں کا وطن لکھنؤ تھا، اس لیے وہیں چلے آئے اور تعلیم وہیں حاصل کی۔ 1905 میں کیننگ کالج سے بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی کرنے کے بعد انھوں نے وکالت شروع کی اور اس پیشے میں آپ کو خاص کامیابی حاصل ہوئی۔ 1926 میں جب ان کی عمر تقریباً پینتالیس سال کی تھی، اچانک انتقال کیا اور کاظم حسین محشر نے آپ ہی کے مصرع سے تاریخ نکالی۔

ان کے ہی مصرعے سے تاریخ ہے ہمراہ عزا
''موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا''

چکبست نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ سرعت سے بدل رہا تھا۔ ایک طرف قدامت کا رنگ تھا، جو ابھی سماج پر چھایا ہوا تھا، اور دوسری طرف نئی تہذیب کی بڑھتی اور چڑھتی ہوئی روشنی تھی جو آہستہ آہستہ اپنا اثر جما رہی تھی۔ کچھ لوگ قدامت پرست تھے، کچھ ایک نئی دنیا کے خواب دیکھ رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو تھوڑی سی اصلاح، تھوڑی سی تبدیلی کے قائل تھے۔ چکبست اس آخری طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ لکھنؤ کی تہذیب، تمدن، معاشرت اور اخلاق کے دلدادہ تھے، مگر اس کے ساتھ زمانے کا رخ دیکھ کر اور روشن خیال اور تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اصلاح و

ترمیم کے بھی حامی تھے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے شاعر، اچھے نقاد اور اچھے اہل قلم تھے، بلکہ اچھے انسان بھی تھے۔ وہ اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو صرف عزت و آرام کی زندگی گذارنے پر قانع نہیں ہوتا، بلکہ قوم کی بہبود اور بہتری کے لیے نہایت نیک خیالات بھی دل میں رکھتا ہے۔ یہ نیک خیالات قدرتی طور پر معتدل اور صلح پسند خیالات ہوتے ہیں۔

چکبست جدید دور کے شعرا میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام ''صبح وطن'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ''صبح وطن'' چکبست کے رجحان کا صحیح پتہ دیتی ہے، کیوں کہ وطن کی محبت چکبست کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ کتاب کے پہلے حصے میں جو نظمیں ہیں وہ تمام تر وطن اور حب وطن سے متعلق ہیں۔ ان میں سے بعض نظمیں سیدھی، صاف اور سہل زبان میں لکھی گئی ہیں۔ وہ نہایت پر اثر ہیں اور بہت مشہور ہو چکی ہیں۔ ''ہمارا وطن دل سے پیارا وطن''، اور ''وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک'' سے شاید ہی کوئی شخص نا آشنا ہو۔

قوم کی آزادی سے متعلق چکبست کا نظریہ ہمارے لبرل سیاست دانوں کے شعور سے تھوڑا ملتا جلتا ہے۔ ''آوازۂ قوم'' میں فرماتے ہیں۔

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے
وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گلچیں نہ صبح و شام رہے
نہ کوئی مرغ خوش الحان اسیر دام رہے

سریر شاہ کا اقبال ہو بہار چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاجدار چمن

''صبح وطن'' کے دوسرے حصہ میں زیادہ تر اصلاحی و مذہبی نظمیں ہیں۔ ان میں بھی زیادہ تر مسدس لکھے گئے ہیں اور چکبست نے اس صنف سخن کو کامیابی سے نبھایا ہے۔ انھوں نے گائے پر ایک اچھی نظم لکھی ہے اور ان کی سب سے دلچسپ نظم ''لڑکیوں سے خطاب'' ہے۔ چکبست عورتوں کی آزادی کے بارے میں ''حدادب'' کے قائل تھے۔ بچپن میں ہم جو کہانیاں سنتے تھے، ان سب میں ایک چیز مشترک ہوتی تھی۔ ہیرو کو اس کی بہن یا ماں تین طرف جانے کی اجازت دیتی تھی اور چوتھی طرف کے لیے منع کرتی تھی۔ نتیجہ ہمیشہ یکساں نکلتا تھا۔ ہر شخص چوتھی سمت کو جانے سے ڈرتا تھا۔ کہیں ہماری لڑکیوں اور عورتوں کا بھی یہی حشر نہ ہو۔ بہر حال نظم کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے۔

روش خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز — داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں — ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
رخ سے پردے کو ہٹایا تو بہت خوب کیا — پردۂ شرم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز
دل تمھارا ہے وفاؤں کی پرستش کے لیے — اس محبت کے شوالے کو نہ ڈھانا ہرگز
اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں — یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز

ہم تمھیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں
تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

کسی زبان کی شاعری صرف گیتوں اور غزلوں سے مالا مال نہیں ہوتی۔ اس میں قدیم مذہبی اور نیم مذہبی داستانوں کی بھی ضرورت ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ''رامائن'' اور ''مہابھارت'' کی داستانیں ابھی اردو میں صرف تبرک کے طور پر ملتی ہیں۔ چکبست نے رامائن کا ایک سین کھینچا ہے، جس کو پڑھ کر ان کی اس صنف

میں قادرالکلامی معلوم ہوتی ہے۔ وہ اس کام کے لیے نہایت موزوں تھے۔

تیسرے حصے میں بیشتر مراثی ہیں۔ یہ مرثیے صرف غم کی داستانیں نہیں ہیں۔ ان میں چکبست نے سیرت نگاری کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیے ہیں۔ گو کھلے اور تلک کے گرد صرف آنسوؤں کا سیلاب ہی نہیں، یہ زندہ اور تابندہ بھی نظر آتے ہیں۔ اس طرح یہ نظمیں صرف وقتی نہیں رہتیں، بلکہ لازوال ہو جاتی ہیں۔

❁❁

غور کرنے کی بات

آل احمد سرور (1911 تا2002) ہمارے زمانے کے سب سے بڑے تنقید نگار کہے گئے ہیں۔ وہ اچھے شاعر بھی تھے، لیکن اس میں تو کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اردو ادب کے اکثر پہلوؤں اور موضوعات پر نہایت عالمانہ لیکن خوبصورت، روانی سے بھر پور، اور شگفتہ زبان میں نہایت با اثر مضامین لکھے۔ ان کی تنقید میں سختی نہیں، شائستگی ہے۔ وہ نکتہ چینی بھی کرتے ہیں تو اس طرح کہ کسی کو برا نہیں لگتا۔ تنقید میں ان کا طریقہ ہمیشہ میانہ روی کا رہا۔ زیر نظر مضمون میں انھوں نے مشہور شاعر برج نرائن چکبست کی تمام خوبیاں آسان زبان میں بیان کر دی ہیں، لیکن ان کی کمزوریوں کی طرف بھی صاف صاف اشارہ کر دیا ہے۔

قوم کی آزادی کے بارے میں چکبست کے خیالات ان لوگوں کے خیالات سے ملتے جلتے تھے جنھیں سرور صاحب نے ''لبرل'' کہا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو مکمل آزادی کی جگہ اس بات کو کافی سمجھتے تھے کہ ملک آزاد رہے لیکن اس پر شاہ برطانیہ کی برائے نام حکومت بھی رہے۔ سرور صاحب نے اس بات کو چند لفظوں میں بڑی خوبی سے بیان کر دیا ہے۔

اسی طرح، چکبست کے اس خیال سے بھی سرور صاحب اتفاق نہیں کرتے کہ عورتوں کو زیادہ سماجی آزادی کی ضرورت نہیں۔ اس بات کو وہ بڑے لطف سے یہ کہہ کر ادا کرتے ہیں کہ چکبست عورتوں کے لیے ''حد ادب'' کے قائل تھے، یعنی صرف ایک حد تک تو وہ آزاد رہیں، لیکن

ان کا اصل میدان عمل گھر ہے، گھر کے باہر نہیں۔ اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے وہ بچپن کی کہانیوں کا پرلطف حوالہ بھی دیتے ہیں۔ اس بنا پر ان کا انداز اور بھی شگفتہ ہو گیا ہے۔

سرور صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ "رامائن" اور "مہابھارت" اردو میں صرف تبرک کے طور پر ملتی ہیں، یعنی ان کے ترجمے اردو میں عام نہیں ہیں۔ ان کا مطلب یہ نہیں کہ اردو میں ان شاہکاروں کے ترجمے نہیں ہوئے۔ ترجمے تو ہوئے، لیکن زیادہ تر ایسے لوگوں نے یہ ترجمے کیے جو بہت زیادہ نمایاں شاعر نہ تھے، اس لیے ان کی شہرت کم ہوئی۔

فرہنگ

قدامت پرست =	Old fashioned; Conservative	रूढ़िवादी, पुराने विचारों, तौर– तरीकों को सबसे अच्छा समझने वाला।
سرعت =	Quickness of speed	तेज़ी, फुर्ती
قانع =	Contented; Satisfied with a small portion	थोड़ी चीज़ पर संतोष कर लेने वाला।
معتدل =	Temperate	संयमी, संतुलित, शीतोष्ण, दरमियाना दर्जे का, न अधिक ठंडा, न गर्म।
لبرل =	Liberal	उदारवादी
خوش الحان =	Sweetly singing; Melodious	अच्छे स्वर वाला
سَریر =	Throne; A royal seat	तख़्त, सिंहासन

مراثی = Plural of مرثیہ, meaning elegy 'मर्सिया' का बहुवचन। एक प्रकार का शोक गीत। वह नज़्म या शेर जिनमें किसी व्यक्ति की मृत्यु या शहादत का हाल और उसकी कठिनाईयों या उसकी मृत्यु से जो हानि हुई है, उसका वर्णन हो।

میر باقر علی

شاہد احمد دہلوی

داستان گوئی کا فن اب ہمارے ہاں بالکل ختم ہو چکا ہے۔ دلی کے آخری داستان گو میر باقر علی تھے جن کے انتقال کو اب بیس برس سے اوپر ہوئے۔ دبلے پتلے سے آدمی تھے، سفید چھوٹی سی داڑھی، سر پر دو پلی، پاؤں میں دیسی جوتی، انگرکھا اور چست پاجامہ پہنتے تھے۔ عمر ساٹھ اور ستر کے درمیان، کھلتا ہوا رنگ، ستواں سی ناک، میانہ قد۔ باتیں کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ داستان سنانے دور دور جایا کرتے تھے۔ رجواڑوں اور نوابوں میں بلائے جاتے تھے۔ ایک زمانے میں ریاست پٹیالہ میں داستان سنانے کے لیے ملازم بھی رہے۔ رئیس مر گیا تو دلی واپس آ گئے۔ املی کی پہاڑی پر گھر تھا۔

آخری وقت میں افلاس نے گھیر لیا تھا۔ سنیما ایسا چلا کہ میر صاحب کی پرسش ختم ہو گئی۔ دلی کے ہندو رئیس چھنامل کے ہاں کسی وقت چالیس پچاس روپے ماہوار پر ملازم تھے۔ چھنامل والوں کا بیان تھا کہ ہم میر صاحب سے بچپن سے ایک داستان سن رہے ہیں۔ بیس پچیس سال ہو گئے، ایک داستان ہی ختم ہونے میں نہیں آتی۔

میرے بچپن میں میر صاحب فراش خانے میں داستان سنایا کرتے تھے۔ ہفتے میں ایک دن ان کا مقرر تھا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ داستان کہتے۔ برسوں یہ سلسلہ جاری

رہا۔ داستان کا ایک حصہ سنانے پائے تھے کہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

میر صاحب کے آبا و اجداد شاہی داستان گو تھے۔ غالباً ان ہی میں سے کسی کے متعلق روایت مشہور تھی کہ بادشاہ کو روزانہ داستان سنایا کرتے تھے۔ ایک ایسا موقع آیا کہ عاشق اور معشوق کے درمیان صرف ایک پردہ حائل تھا۔ پردہ اٹھ جائے تو وصال ہو جائے۔ مگر داستان گو نے احساسات، خیالت، اور کیفیات کے بیان میں بارہ سال گذار دیے اور پردہ نہ اٹھا۔ آخر بادشاہ کا اشتیاق بے قابو ہو گیا اور اس نے تنگ آ کر کہا، ''آج پردہ اٹھ جانا چاہیے۔'' تب کہیں وہ پردہ اٹھا۔

میر صاحب کا بھی اس سے کچھ ملتا ہوا لہجہ تھا۔ بیگم کے بناؤ سنگھار میں ایک نشست ختم کر دیتے تھے۔ آراستہ ہونے کی تفصیل، زیورات کی قسمیں، لباس کی قسمیں: زیورات کی تفصیل شروع ہوتی تو میر صاحب سینکڑوں نام سنا جاتے۔ پھر یہ بھی بتاتے کہ شاہی بیگموں کے زیور کیا ہوتے تھے، درمیانہ طبقہ کی خواتین کون سے زیور پہنتی تھیں، بھٹیارنیاں، سقنیاں، اور مہترانیاں کیا کیا پہنتی تھیں۔

میر صاحب رزم اور بزم کو اس انداز میں بیان کرتے کہ آنکھوں کے سامنے پورا نقشہ کھنچ جاتا۔ داستان کہتے جاتے اور موقع بہ موقع ایکٹنگ کرتے جاتے۔ آواز کے زیر و بم اور لب و لہجے سے بھی اثر بڑھاتے۔ امیر حمزہ اور عیاروں کا جب بیان کرتے تو ہنساتے ہنساتے لٹا دیتے۔ ہتھیاروں کا نام گنانے شروع کرتے تو سو ڈیڑھ سو نام ایک ہی سانس میں لے جاتے۔ پھر کمال یہ کہ نام صرف طوطے کی طرح رٹے ہوئے نہیں تھے، بلکہ آپ جب چاہیں ٹوک کر کسی ہتھیار کی شکل اور اس کا استعمال دریافت کر سکتے تھے۔ میر صاحب پوچھنے سے چڑتے نہ تھے، بلکہ خوش ہوتے اور تفصیل سے بتاتے۔ انھوں نے یہ وسیع معلومات بڑی محنت سے حاصل کی

تھیں۔ ہر علم کا انھوں نے با قاعدہ مطالعہ کیا تھا، استادوں سے با قاعدہ سیکھا تھا۔ اور تو اور جب دلی میں طبیہ کالج کھلا تو میر صاحب نے ساٹھ سال کی عمر میں اس میں داخلہ لیا اور لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنے لگے اور وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کی سند بھی حاصل کی۔

میر صاحب کی داستان جہاں ہوتی وہاں اجلی چاندنیوں کے فرش بچھ جاتے۔ میر صاحب کے لیے ایک چھوٹا سا تخت بچھا دیا جاتا، اس پر قالین اور گاؤ تکیہ ہوتا۔ سامعین گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ جاتے۔ پان اور حقے کا دور چلتا رہتا۔ گرمیوں میں شربت اور جاڑوں میں چائے سے تواضع کی جاتی۔ میر صاحب تخت پر براجمان ہوتے، کٹورے یا گلاس میں پانی منگواتے۔ جیب میں سے چاندی کی چھوٹی سی ڈبیا اور چاندی کی چھوٹی سی پیالی نکالتے۔ ڈبیا میں سے افیون کی گولی نکالتے، اسے روئی میں لپیٹتے۔ پیالی میں تھوڑا سا پانی ڈال کر آنٹے کو اس میں گھولتے رہتے اور دوستوں سے باتیں کرتے رہتے۔ جب ساری افیون گھل کر پانی میں آ جاتی تو روئی اگال دان میں پھینک دیتے اور گھولوے کی چسکی لگاتے۔ اس کے بعد چائے کا ایک گھونٹ پیتے۔ فرماتے، ''چائے کی خوبی یہ ہے کہ لب بند، لبریز اور لب سوز ہو۔'' پھر داستان شروع کر دیتے۔

دلی میں کہیں داستان کہنے جاتے تو دو روپے لیا کرتے۔ پھر ایک دور آیا کہ لوگوں کو دو روپے بھی اکھرنے لگے تو میر صاحب نے اپنے گھر میں داستان کہنی شروع کر دی اور ایک آنہ ٹکٹ لگا دیا۔ دس بیس شائقین آ جاتے اور میر صاحب کو روپیہ سوا روپیہ مل جاتا۔ بعض دفعہ سامعین کی حسب فرمائش کسی ایک پہلو کو بیان کرتے۔ کوئی کہتا، ''میر صاحب آج تو لڑائی کا بیان ہو جائے۔'' اور میر صاحب رزم

کو اس تفصیل کے ساتھ پیش کرتے کہ آنکھوں کے سامنے میدان جنگ کا نقشہ آجاتا۔ کوئی کہتا، ''میر صاحب آج تو عیاریاں بیان ہو جائیں۔'' اور میر صاحب عیاروں کے کارنامے بیان کرنے لگتے تھے۔

میر باقر علی اپنے نانا میر پیڑا کے شاگرد تھے۔ جن بزرگوں نے میر پیڑا کی داستانیں سنی تھیں، کہتے تھے کہ باقر علی کی داستان ان کی پاسنگ بھی نہیں تھی۔ غالباً فرق یہی ہوگا کہ وہ بارہ سال تک پردہ پڑا رہنے دیتے ہوں گے، میر باقر علی دو سال میں پردہ اٹھا دیتے تھے۔

بڑھاپے میں ناقدری اور کس مپرسی کے ہاتھوں میر صاحب کو بڑی تکلیف پہنچی۔ دلی کا کامل الفن آخری داستان گو اپنا پیٹ پالنے کے لئے چھالیا بیچتا تھا۔ ❁❁

غور کرنے کی بات

داستان سے مراد کوئی ایسی کہانی ہے، جسے زبانی بیان کیا جائے۔ یا اگر اسے لکھا بھی گیا ہو تو اس غرض سے کہ اسے زبانی بیان کیا جائے گا۔ داستان کے لیے اس کا لمبا ہونا کوئی شرط نہیں، لیکن تقریباً ہر داستان میں رزم (دو فوجوں یا دو ملکوں کے درمیان جنگ یا دو سرداروں کی آپسی لڑائی)، بزم (عشق و عاشقی اور محفل آرائی)، طلسم (جادو، جادوگروں کی بنائی ہوئی دنیائیں وغیرہ)، اور عیاری (چالاکی، جاسوسی، بھیس بدل کر کام کرنا، تیزی اور اپنے مالک یا مربی کے لیے پوری طرح معتبر ہونا، جادو کا جواب چالاکی سے دینا وغیرہ)، یہ چار عناصر ضرور ہوتے ہیں۔ لہٰذا داستان عام طور پر بہت لمبی ہوتی ہے۔ داستان سنانے والے کو اردو میں ''داستان گو'' کہتے ہیں۔ پہلے زمانے میں ''افسانہ خواں''، ''قصہ خواں'' وغیرہ الفاظ بھی رائج تھے۔ دوسری بات یہ کہ داستان گو اپنی مرضی سے نئے واقعات ملا کر، یا کسی ایک واقعے کو بہت تفصیل سے بیان کر کے داستان کو طویل کر سکتا تھا۔ اسے ''داستان روکنا'' کہتے تھے۔

دہلی کے مشہور ادیب شاہد احمد دہلوی (1906 تا 1967) جو خود ایک بہت بڑے ادیب

مولوی نذیر احمد (1830 تا 1912) کے نواسے تھے، اپنے رسالے ''ساقی'' (دہلی، اور پھر کراچی) میں دہلی کے لوگوں کا حال لکھتے تھے۔ میر باقر علی داستان گو کے حال میں انھوں نے ''داستان روکنے'' کی بھی دو مثالیں دی ہیں۔ اسے انھوں نے ''پردہ اٹھانے'' سے تعبیر کیا ہے، کہ عاشق اور معشوق کی ملاقات ہونے کو ہے، صرف ایک پردہ اٹھنا باقی ہے، لیکن اس پردے کو ''اٹھانے'' میں شاہی داستان گو نے بارہ برس لگا دیے۔ شاہد احمد دہلوی کہتے ہیں کہ میر باقر علی بھی ''پردہ اٹھانے'' میں دو سال تو لگا ہی سکتے تھے۔

آج سے کچھ پہلے تک شمالی افریقہ، عراق، اور دوسرے ملکوں کے داستان گویوں کے بارے میں بھی یہ بات دیکھی گئی ہے کہ وہ کسی بھی واقعے کو (مثلاً یہ کہ شہزادہ گھوڑے پر سوار ہونے جا رہا ہے) بیان کرنے میں پورا دن لگا سکتے تھے۔ بوسنیا (Bosnia) کے بھی مسلمان داستان گویوں کی داستانیں کئی مہینے چل سکتی تھیں۔

شاہد احمد دہلوی نے داستان گوئی کے زوال کا ذمہ دار فلم (جسے انھوں نے پرانے لوگوں کے انداز میں ''سنیما'' (Cinema) کو ٹھہرایا ہے۔ اس بات میں ایک حد تک سچائی ہے۔

''داڑھی'' اور ''ڈاڑھی'' دونوں صحیح ہیں، پورب میں ''داڑھی'' زیادہ رائج ہے۔ دلی میں دونوں طرح بولتے ہیں۔

فرہنگ

ستواں =	Thin and slim (used for the nose) also called سوتواں	लम्बी और सीधी (नाक की विशेषता)। इसे 'सौतुवां' भी कहते हैं।
آباواجداد =	Ancestors	बाप–दादा, पूर्वज
درمیانہ طبقہ =	The middle class	मध्य वर्ग

سقّنی =	Water-woman; this word is the feminine of "saqqa"	पानी पिलाने वाली महिला। 'सक़्क़ा' का स्त्रीलिंग।
فارغ التحصیل ہونا =	To obtain the highest graduation degree from a school or academic institution	किसी विद्यालय या शैक्षिक संस्था की अन्तिम स्नातक उपाधि प्राप्त करना।
آنٹا =	An opium pill, especially, a large opium pill. The correct word is "anta". Shahid Ahmad Dihlavi has probably used a local form	अफ़ीम की गोली, विशेषतः बड़ी गोली। सही शब्द 'अंटा' है। शाहिद अहमद दहलवी ने संभवतः क्षेत्रीय मुहावरा बरता है।
پاسنگ =	A very small part. "Pasang" is actually the small weight that is used to correct the balance of a scale	बहुत थोड़ा सा हिस्सा। पासंग उस थोड़े से वज़न को कहते हैं जो तराजू का संतुलन ठीक करने के लिए प्रयोग में लाया जाता है।

کس مپرسی = When no one asks about the condition or affairs of someone, it is called that someone's کس مپرسی , that is, a state of utter neglect. کس مپرسی can be written as کسمپرسی too, but it's preferable to write it separate, as two words

जब किसी का हाल या बात कोई न पूछे तो उस अवस्था को 'कसमपुर्सी' कहते हैं, अर्थात अत्यन्त दीन हीनता।

عمر بن عبدالعزیزؒ کی کچھ خصوصیات

شبلی نعمانی

علامہ ابن جوزی نے جو مشہور مصنف گذرے ہیں، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حالات پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ''سیرۃ العمرین'' رکھا تھا۔ سلطان صلاح الدین کے زمانے میں اسامہ بن مُنقذ ایک عرب سپہ سالار تھا جو فوجی قابلیت کے ساتھ علمی مذاق بھی رکھتا تھا، اس نے متعدد دلچسپ کتابیں تصنیف کیں۔ اسی مصنف نے علامہ ابن جوزی کی کتاب مذکورۂ بالا کا دوسرا ٹکڑا، جو عمر بن عبدالعزیز کے متعلق تھا، جدا کر کے ایک علیحدہ کتاب کی شکل میں مرتب کیا۔ اس کتاب کو یورپ کے ایک فاضل نے، جس کا نام ہنری بیکر ہے، 1900 میں چھاپ کر شائع کیا۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کی حکومت و سلطنت کا اصلی اصول مساوات اور جمہوریت تھی۔ یعنی یہ کہ تمام لوگ یکساں حقوق رکھتے ہیں، اور بادشاہ کو کسی پر کسی قسم کی ترجیح حاصل نہیں۔ صرف ملکی امور میں نہیں، بلکہ معاشرت اور ذاتی زندگی میں بھی وہ اس کا لحاظ رکھتے تھے۔ دن کے کھانے کا یہ طریقہ تھا کہ عام مسلمانوں کے لیے جو لنگر خانہ تھا، اس میں ایک درہم روز بھیج دیا کرتے تھے اور وہیں جا کر عام مسلمانوں کے ساتھ کھا لیتے تھے۔

بنوامیہ نے غضب یہ کیا تھا کہ باغ فدک کو، جس کو حضرت فاطمہ زہراؓ کے تقاضے پر بھی حضرت ابوبکر نے اس بنا پرنہیں دیا کہ وہ عام مسلمانوں کا حق ہے، اپنا خالصہ بنالیا تھا۔عمر بن عبدالعزیز نے اسے خاندان رسالت میں منتقل کر دیا۔ خاندان بنوامیہ میں سخت برہمی پیدا ہوئی۔ سب نے متفق ہوکر ہشام بن عبدالملک کو عمر بن عبد العزیز کے پاس بھیجا کہ اس فیصلے پر نظر ثانی کریں اور قدما جو فیصلہ کر گئے اس کو بحال رکھیں۔عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا کہ اگر میرے سامنے ایک فرمان امیر معاویہ کا پیش کیا جائے اور ایک عبدالملک کا، تو مجھ کو کس پر عمل کرنا چاہیے؟ ہشام نے کہا، ''جو مقدم ہو۔'' عمر بن عبدالعزیز نے کہا، ''تو خدا کا فرمان سب پر مقدم ہے۔''

عمر بن عبدالعزیزؓ ایک دفعہ رات کے وقت مسجد میں گئے۔ ایک شخص صحن مسجد میں لیٹا ہوا تھا۔ اتفاق سے عمر بن عبدالعزیز کے پاؤں کی ٹھوکر اس کو لگی۔ اس نے جھلا کر کہا، ''کیا تو پاگل ہے؟'' عمر بن عبدالعزیز نے کہا، ''نہیں۔'' پولیس کے آدمی موجود تھے، انھوں نے اس شخص کو گستاخی کی سزا دینی چاہی۔ عمر بن عبدالعزیز نے کہا، ''کیوں، اس نے کیا گناہ کیا ہے؟ اس نے تو صرف پوچھا تھا کہ کیا تم پاگل ہو؟ میں نے کہہ دیا، نہیں۔''

عمر بن عبدالعزیزؓ نے جب وفات پائی تو کل ۱۷ دینار چھوڑے، جس میں سے تجہیز و تکفین کے مصارف ادا کرنے کے بعد دس دینار بچے جو ورثہ پر تقسیم ہوئے۔

غرض عمر بن عبدالعزیز کی خلافت اور سلطنت ٹھیک اسی اصول کا نمونہ تھی جو اسلام نے قائم کیا تھا اور جس کو سلاطین بنی امیہ و عباسیہ میں تلاش کرنا بالکل بے فائدہ ہے۔ یہ لوگ خلیفہ نہ تھے، بلکہ کسریٰ و قیصر تھے۔ ❁❁

غور کرنے کی بات

شبلی (1857 تا1914) کو عام طور پر ''علامہ'' (= بہت بڑا عالم) شبلی کہا جاتا ہے۔ وہ خود کو نعمانی لکھتے تھے کیونکہ امام ابو حنیفہ(80 ہجری مطابق699 حالی تا 150 ہجری مطابق 767 حالی) سے انھیں بہت عقیدت تھی اور امام صاحب کا اصل نام نعمان تھا۔ شبلی کو اردو کے سب سے بڑے نثر نگاروں، مورخوں اور فارسی ادب کے ماہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ فارسی اور اردو میں بہت عمدہ شاعر بھی تھے۔ سر سید کے خاص ساتھیوں میں وہ بھی تھے۔ ہم نے ان کا یہ مضمون ''مقالات شبلی'' کی چوتھی جلد سے لیا ہے۔ شبلی نے متعدد کتابیں لکھنے کے علاوہ دو بڑے تعلیمی اور ادبی ادارے قائم کیے، ایک تو لکھنؤ میں ندوۃ العلماء، اور دوسرا اعظم گڈھ میں دارالمصنفین جسے شبلی اکیڈمی بھی کہتے ہیں۔

شبلی کی نثر میں وہی علمی وقار ہے جو ہم نے حالی کے یہاں دیکھا۔ لیکن وہ اپنے قاری سے پوری توجہ چاہتے ہیں اور پیچیدہ جملے بناتے ہیں۔ مندرجۂ ذیل پر غور کریں:

علامہ ابن جوزی نے جو... جس کا نام...

سلطان صلاح الدین کے زمانے... جو... اس نے...

اسی مصنف نے... کا دوسرا ٹکڑا جو... جدا کر کے... علیحدہ کتاب کی...

حالی کے یہاں اس طرز کے جملے کم ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں کو ملا کر لمبا جملہ بناتے ہیں لیکن ان کے یہاں پیچیدگی نہیں۔ شبلی کے یہاں ایک بات یہ بھی ہے وہ اپنے پڑھنے والے سے امید رکھتے ہیں کہ وہ موضوع کے بارے میں پہلے ہی سے کچھ جانتا ہوگا۔ اس لیے وہ بہت سے لوگوں اور کتابوں کا سرسری ذکر کرتے ہیں، لیکن عام طور پر وہ ان کی وضاحت نہیں کرتے۔

ابن جوزی اپنے وقت کے مشہور عالم اور کئی فنون کے ماہر تھے۔ بغداد میں پلے بڑھے، 1201 میں انتقال کر گئے اور بغداد ہی میں دفن ہیں۔ حضرت عمرؓ فاروق کو عمرؓ ابن الخطاب بھی کہا جاتا ہے۔ رسول اسلامؐ کے انتقال کے بعد مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ بنے، اس لیے انھیں

"خلیفۂ دوم" بھی کہا جاتا ہے۔آپ اگست 634 حالی مطابق جمادی الاخریٰ 13 ہجری کو خلیفہ بنے اور نومبر 644 حالی مطابق ذی الحجہ 23 ہجری کو شہید ہوئے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے 1187 میں صلیبی جنگ میں فتح حاصل کر کے یروشلم پر مسلمانوں کا قبضہ بحال کیا تھا۔اس کا انتقال 1194 میں ہوا۔اسامہ بن مُنقذ کی تفصیلات نہیں معلوم،لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اس زمانے میں فوجی افسر بھی کس قدر علمی ذوق رکھتے تھے۔

بنوامیہ (یا بعض صورتوں میں بنی امیہ) ان لوگوں کو کہتے ہیں جو عرب کے ایک مشہور اور بہت قدیمی سردار امیہ کی اولاد میں ہوں۔ایک دوسرا خاندان جو بنی امیہ سے بھی زیادہ عزت والا سمجھا جاتا ہے، اسے بنی ہاشم کہتے ہیں۔ہاشم بھی امیہ کی طرح عرب کے قدیمی بزرگوں میں تھے۔یہ دونوں خاندان "قریش"، یا "قرشی" کہلاتے تھے، کیونکہ جس قبیلے کے وہ فرد تھے وہ "قریش" کہلاتا تھا۔حضرت عمر بن عبدالعزیز کا خاندان بنو امیہ میں شامل تھا۔ آپ ستمبر/اکتوبر 717 مطابق 99 ہجری میں دمشق میں تخت خلافت پر بیٹھے اور فروری 720 میں آپ کا انتقال ہوا۔

بی بی فاطمہ زہرؓا (پیدائش تقریباً 606 حالی اور اور انتقال نومبر 632 حالی، مطابق رمضان 11 ہجری) کو سیدہ اور خاتون جنت بھی کہتے ہیں۔آپ پیغمبر اسلام کی بیٹی تھیں، بعد میں حضرت علیؓ سے آپ کی شادی ہوئی۔

معاویہ بن ابوسفیان (وفات 680 حالی مطابق 60 ہجری) بہت بڑے سرداران عرب میں تھے۔ان کو "امیر معاویہ" کہا جاتا ہے۔ان کے زمانے میں مسلمانوں میں بہت اختلاف ہوا۔انھوں نے دمشق میں اپنی حکومت قائم کر لی اور اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

علامہ شبلی نے "پولیس" لکھا ہے اور یہی صحیح ہے۔پہلے زمانے میں "پُلِس" کہتے تھے۔ اب ہندی کی دیکھا دیکھی بعض لوگ "پولس" لکھنے لگے ہیں جو بالکل غلط ہے۔

فرہنگ

عمرین =	The two Omars, that is, Omar ibn Khattab and Omar ibn Abdul Aziz. Also called "Umaran".	दोनों उमर, अर्थात हज़रत उमर बिन ख़त्ताब और उमर बिन अब्दुल अज़ीज़। इनको 'उमरान' भी कहा जाता है।
مساوات =	Equality	बराबरी, समानता।
جمہوریت =	Democracy	जनतन्त्र। शासन की वह प्रणाली जिसमें जनमत से शासक चुना जाता है।
خالصہ =	Crown land	राज भूमि, वह भूभाग जो शासक अपने लिए विशिष्ट करले और उसकी आमदनी सरकारी कोष में न जाऐ।
خاندان رسالت =	The family of Muhammad, the Prophet of God	हज़रत मुहम्मद (इस्लाम के पैग़म्बर) का परिवार
مقدم =	Superior	बेहतर, वरिष्ठ

تجہیز =	To arrange for the things necessary for a burial. This word is always spoken with "takfin".	व्यवस्था करना, विशेषतः मुर्दे (मृत) के अन्तिम संस्कारों की व्यवस्था करना। यह शब्द अकेले नहीं बोला जाता बल्कि 'तकफ़ीन' के साथ बोला जाता है।
تکفین =	To wrap a dead body in a shroud	कफ़न देना, कफ़न में लपेटना
ورثہ	Heirs	'वारिस' का बहुवचन। उत्तराधिकारी
کسریٰ =	The title of ancient Iranian kings, the Arabicized form of "Khusrau", in English, Chosroe	प्राचीन ईरानी बादशाहों की उपाधि। यह शब्द फ़ारसी शब्द 'खुसरौ' का अरबी रूप है।
خلیفہ =	The ruler of Muslims who functions in place of the Prophet of God	मुसलमानों का वह शासक जो हज़रत मुहम्मद का नायब हो।
قیصر =	Caesar	रोम (वर्तमान तुर्की या इटली) के शासक की उपाधि।

کاہلی

سرسید احمد خاں

کاہلی ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا، کام کاج، محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا، اٹھنے بیٹھنے چلنے میں سستی کرنا کاہلی ہے۔ مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔

ہاتھ پاؤں کی محنت، اوقات بسر کرنے اور روٹی کما کر کھانے کے لیے نہایت ضروری ہے، اور روٹی پیدا کرنا اور پیٹ بھرنا ایک ایسی چیز ہے کہ بہ مجبوری اس کے لیے محنت کی جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں کی کاہلی چھوڑی جاتی ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ محنت مزدوری کرنے والے لوگ، اور وہ جو کہ اپنی روزانہ محنت سے اپنی بسر اوقات کا سامان مہیا کرتے ہیں، بہت کم کاہل ہوتے ہیں۔ محنت کرنا اور سخت سخت کاموں میں ہر روز لگے رہنا، گویا ان کی طبیعت ثانی ہو جاتی ہے۔ مگر جن لوگوں کو ان باتوں کی حاجت نہیں ہے وہ اپنے دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ کر بڑے کاہل اور بالکل حیوان صفت ہو جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ترقی بھی کرتے ہیں، اور ہزار پڑھے لکھوں میں سے شاید ایک کو ایسا موقع ملتا ہوگا کہ اپنی تعلیم کو اور اپنی عقل کو ضرور تا

کام میں لاوے، لیکن اگر انسان ان عارضی ضرورتوں کا منتظر رہے اور اپنے دلی قویٰ کو بے کار ڈال دے تو وہ نہایت سخت، کاہل اور وحشی ہو جاتا ہے۔ انسان بھی مثل اور حیوانوں کے ایک حیوان ہے اور جب کہ اس کے دلی قویٰ کی تحریک سست ہو جاتی ہے اور کام میں نہیں لائی جاتی تو وہ اپنی حیوانی خصلت میں پڑ جاتا ہے۔ پس ہر ایک انسان پر لازم ہے کہ اپنی اندرونی قویٰ کو زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے، اور ان کو بیکار نہ چھوڑے۔

ایک ایسے شخص کی حالت کو خیال کرو جس کی آمدنی اس کے اخراجات کو مناسب ہو اور اس کے حاصل کرنے میں اس کو چنداں محنت و مشقت کرنی نہ پڑے اور وہ اپنے دلی قویٰ کو بھی بے کار ڈال دے تو اس کا کیا حال ہوگا۔ یہی ہوگا کہ اس کے عام شوق وحشیانہ باتوں کی طرف مائل ہوتے جاویں گے۔ شراب پینا اور مزے دار کھانا اس کو پسند ہوگا۔ قمار بازی اور تماش بینی کا عادی ہوگا۔ اور یہی سب باتیں اس کے وحشی بھائیوں میں بھی ہوتی ہیں۔ البتہ اتنا فرق ہوتا ہے کہ وہ پھوہڑ، بدسلیقہ، وحشی ہوتے ہیں اور یہ ایک وضعدار وحشی ہوتا ہے۔

ہم قبول کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کے لیے ایسے کام بہت کم ہیں، جن میں ان کو قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع ملے۔ اور برخلاف اس کے اور ولایتوں میں اور خصوصاً انگلستان میں وہاں کے لوگوں کے لیے ایسے موقعے بہت ہیں۔ اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ انگریزوں کو بھی کوشش اور محنت کی ضرورت اور اس کا شوق نہ رہے، جیسا کہ اب ہے تو وہ بھی بہت وحشت پنے کی حالت کو پہنچ جاویں گے۔ مگر ہم اپنے ہم وطنوں سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو ہم کو اپنے قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع نہیں رہا ہے، اس کا

بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے۔ یعنی اپنے دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ دیا ہے۔ اگر ہم کو قوائے قلبی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع نہیں ہے تو ہم کو اسی کی فکر اور کوشش کرنی چاہئے کہ وہ موقع کیوں کر حاصل ہو۔ اگر اس کے حاصل کرنے میں ہمارا کچھ قصور ہے تو اسی کی فکر اور کوشش کرنی چاہئے کہ وہ قصور کیوں کر رفع ہو۔ غرض کہ کسی شخص کے دل کو بے کار پڑا رہنا نہ چاہئے۔ کسی نہ کسی بات کی فکر و کوشش میں مصروف رہنا لازم ہے، تاکہ ہم کو اپنی تمام ضروریات کے انجام کرنے کی فکر اور مستعدی رہے۔ اور جب تک کہ ہماری قوم سے کاہلی یعنی دل کا بے کار پڑا رہنا نہ چھوٹے گا اس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی بہتری کی توقع کچھ نہیں ہے۔ نہایت حکیمانہ قول ہے کہ ؎

بے کار مباش کچھ کیا کر   گر کر نہ سکے تو کچھ کہا کر

❁❁

غور کرنے کی بات

سر سید احمد خان (1817 تا 1898) کا یہ مضمون اب سے کوئی ایک سو تیس برس پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ اس زمانے میں لوگ عام طور پر بڑے بڑے لفظوں کا استعمال کرتے تھے اور روزمرہ کی چھوٹی موٹی باتوں پر مضمون نہیں لکھتے تھے۔ سادہ زبان لکھنے اور عام زندگی کے بارے میں مضمون لکھنے کا رواج بڑی حد تک سر سید نے اردو میں شروع کیا۔ سر سید کا ذاتی نام سید احمد تھا اور وہ دہلی کے بڑے لوگوں کے خاندان سے تھے۔ مغل بادشاہ کی طرف سے انھیں ''جواد الدولہ'' اور ''خان'' کے خطابات حاصل تھے۔ جب انگریز نے انھیں ''سر'' [Sir] کا خطاب دیا تو انگریزی قاعدے کے مطابق انگریز لوگ انھیں ''سر سید'' کہنے لگے۔ یہ طریقہ اتنا رائج ہوا کہ اردو والے بھی انھیں ''سر سید'' کہنے اور لکھنے لگے۔

سر سید کی زبان آج بھی ٹھیک سے سمجھ میں آجاتی ہے مگر ان کی بعض باتیں اب رائج

نہیں ہیں۔مثال کے طور پر غور کیجیے:

''طبیعت ثانی'' بمعنی ''عادت'' بالکل ٹھیک ہے، لیکن آج کل ''طبیعت ثانیہ'' زیادہ رائج ہے۔''لائے'' کی جگہ ''لاوے''۔ پرانے زمانے میں بہت سے الفاظ (مصادر) ''نا'' نہیں بلکہ ''ونا'' پر ختم ہوتے تھے۔جیسے ''جاونا''، ''لاونا''، ''پیونا''، ''کھاونا'' وغیرہ۔سرسید نے اسی کا خیال کر کے ہر جگہ ''لائے'' کی جگہ ''لاوے'' وغیرہ لکھا ہے۔ اسی طرح، سر سید نے ''وحشت پنا'' لکھا ہے۔آج کل ''وحشی پن'' یا ''وحشیانہ پن'' بولتے ہیں۔

''رفع ہونا'' کے معنی آج کل ہیں ''ختم ہو جانا''۔جیسے ''مشکل رفع ہوگئی''۔سرسید نے اسے اس کے اپنے اصل عربی معنی یعنی اٹھ جانے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔'' قصور کیوں کر رفع ہو۔''

اس بات پر دھیان دیجئے کہ بعد کے اکثر لوگوں کے طریقے کے بالکل خلاف سرسید نے اپنے تمام ہم وطنوں کو خطاب کیا ہے۔صرف ہندو یا صرف مسلمان کو نہیں۔

سرسید نے ''دلی قویٰ'' اور ''عقلی قویٰ'' میں فرق کیا ہے۔یعنی دل کے جذبات، اور سوچنے سمجھنے کی طاقت۔آج کل یہ الفاظ نہیں بولے جاتے۔ان کی جگہ صرف ''جذبات'' اور صرف ''عقل'' کہا جاتا ہے۔

یہ بات بھی آپ کے دھیان میں رہے کہ جس طرح کا مضمون ابھی آپ نے پڑھا، جس میں پڑھنے والے کو کوئی نصیحت کی جائے یا روز مرہ زندگی میں اس کی بھلائی کی کوئی بات کہی جائے، اس طرح کا مضمون اردو میں سرسید کے پہلے رائج نہ تھا اور نہ ہی اس طرح کی زبان عام طور پر لکھی جاتی تھی۔سرسید نے اپنے ان مضامین کے ذریعے اردو نثر کو جدید زمانے سے پوری طرح ہم آہنگ کر دیا۔

''ولایت'' کے معنی صرف ''ملک'' ہوتے ہیں۔انگریزوں کے پہلے ایران یا افغانستان کو ''ولایت'' کہا جاتا تھا، گویا یہی دو ولایتیں ہوں۔اسی کی دیکھا دیکھی انگریزوں کے راج میں ہم لوگ انگلستان کو ''ولایت'' اور وہاں کے لوگوں کو ''ولایتی'' کہنے لگے۔

''گر کر نہ سکے تو کچھ کہا کر'' کچھ مزاحیہ ہے، لیکن کچھ طنزیہ بھی ہے۔یعنی کچھ نہ کرتے

بنے تو بکواس ہی بکتے رہو۔

فرہنگ

طبیعت ثانی =	Habit	आदत, स्वभाव, अभ्यास।
دلی قویٰ =	Powers relating to the heart	वे शक्तियां जो दिल से सम्बन्धित हों।
اوقات بسر کرنا =	To pass (one's) days; to earn a livelihood	जीवन यापन, जीविकोपार्जन
عارضی =	Short lived, temporary	अस्थाई, जो कम देर ठहरे।
حیوان =	Living being; Wild animal	जीव, पशु, जंगली पशु
حیوانی خصلت =	Animal nature; Base nature	पशु–प्रवृत्ति, पशुओं जैसी प्रकृति, स्वभाव
پس =	Therefore; So	इसलिए, अतः
اخراجات =	Expenditure	'खर्च' का बहुवचन। व्यय।
چنداں =	A little	थोड़ा सा। थोड़ी सी।
وحشیانہ =	Having the nature of, or being like uncivilized people or animals	असभ्य, जानवरों जैसा।
قماربازی =	Gambling	जुआ खेलना

تماش بینی =	Enjoying plays and dances and sports	खेलकूद, संगीत–नृत्य और स्वांग इत्यादि देखना और उनसे आनन्दित होना।
وضعدار =	One who maintains his usual habits or manners	अपनी रीति और आचार पर स्थिर रहने वाला।
قوت عقلی =	Power of intellect or wisdom	बुद्धि बल, बौद्धिक शक्ति।
ولایتی =	English; Englishman	अंग्रेज़, अंग्रेज़ी।
وحشت =	Wildness of manner or behaviour	आचार व्यवहार में सभ्य और गम्भीर न होने की स्थिति, घबराहट।
قوائے قلبی =	Powers relating to heart	हृदय से सम्बन्धित शक्तियाँ।
رفع ہونا =	To be removed	दूर हो जाना, समाप्त हो जाना।
حکیمانہ =	Philosophical	बुद्धिमत्तापूर्ण, दर्शनिक।

انگریز افسر سے ملاقات

نذیر احمد

میں جب دیکھتا ہوں کہ اب بہت دن ہو گئے ہیں تو ہفتوں پہلے سے ارادہ کرتا ہوں اور آخر زبردستی ٹھیل ٹھیل کر اپنے تئیں لے جاتا ہوں تو کوٹھی پر جا کر وہی بے لطفی، وہی بے عزتی۔

جاڑا ہو، پانی برستا ہو، کڑاکے کی دھوپ ہو، لوئیں چلتی ہوں، ہندوستانی ڈپٹی نہیں، ڈپٹی کا باوا کیوں نہ ہو، اور چاہے وہ اپنے مکان سے چار گھوڑے کی بگھی پر سوار ہو کر کیوں نہ آیا ہو، کلکٹر، جنٹ، اسسٹنٹ کی تو بڑی بارگاہیں ہیں، اگر یوریشین ڈپٹی کلکٹر سے بھی ملنے گیا ہے (اور اگر نہ ملے تو رہے کہاں)، تو احاطے کے باہر اترنا ضرور، اور احاطے بھی شیطان کی انتڑی، کہ ہم جیسے پرانے فیشن کے لوگ کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگتے ہیں۔ اور اگر صاحب کہیں اس حال میں دیکھ پائیں تو سمجھو کہ ملاقات کو گئے، نوکری نذر کر آئے۔ اسی دن رپورٹ دھری ہوئی ہے کہ یہ شخص دو قدم پیدل نہیں چل سکتا۔ گویا ڈپٹی کلکٹر کو ضرور ہے کہ کم سے کم ڈاک کے ہرکارے کی ایک چوکی تک پویہ نہیں تو دلکی پیشی کا بستہ لے کر ضرور بھاگے۔ پس اس ڈر کے مارے کسی درخت کی آڑ میں، یا کوئی ایسا ہی گانٹھ کا پورا ہے اور اس نے شاگرد پیشوں کو پہلے سے چکھوتیاں کرا دی ہیں، تو باورچی خانے، یا اصطبل میں پاؤ گھنٹے آدھ گھنٹے کھڑے

کھڑے دم لیا اور جب سانس اچھی طرح پیٹ میں سمانے لگا تو رومال سے منہ ہاتھ پونچھا، ہاتھ سے ڈاڑھی مونچھ کو سنوارا، آہستہ سے عمامے کو ذرا اور جما لیا، چغے کے دامن سمیٹے، اور بڑے مودب مقطع بن کر ہاتھ باندھے، نیچی نظریں کیے، ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں کوٹھی کی طرف کو بڑھے۔

خدمت گار اور اردلی کے چپراسیوں نے تو احاطے کے باہر ہی سے تاڑ لیا تھا، کوٹھی کے پاس آتے دیکھ کر قصداً ادھر ادھر کو ٹل گئے۔ تھوڑی دیر زینے کے نیچے ٹھٹکے کہ کوئی آدمی آئے تو اوپر چڑھنے کا قصد کریں۔ چلنے کی، باتوں کی، اور چیزوں کے رکھنے اٹھانے گھسیٹنے کی آوازیں ہیں کہ چلی آرہی ہیں مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ آخر ناچار، ستون کی آڑ میں جوتیاں اتار، ہمت کر کے بے بلائے اوپر پہنچے۔ کرسی نہیں، مونڈھا نہیں، فرش نہیں، کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں، لوٹ چلیں؟ پھر خیال آتا ہے کہ ایسا نہ ہو لوٹتے کو صاحب اندر آئینوں میں دیکھ لیں۔ شرمندگی کے ٹالنے کو وہیں تھوڑی سی جگہ پر ٹہلنا شروع کیا۔ اتنے میں باورچی خانے کی طرف سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ جی خوش ہوا کہ اس سے صاحب کا اور اردلی کے لوگوں کا حال معلوم ہوگا۔ وہ لپک کر ایک دوسرے دروازے سے اندر گھس گیا اور ادھر کو رخ بھی نہ کیا۔

غرض کوئی آدھے گھنٹے (اور اس انتظار میں تو ایسا معلوم ہوا کہ دو گھنٹے) اسی طرح کھڑے سوکھا کیے۔ بارے خدا خدا کر کے ایک چپراسی اندر سے چٹھی لیے ہوئے نمودار ہوا۔ کیا کریں اپنی غرض کے لیے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ حیا اور غیرت کو بالائے طاق رکھ کر آپ منہ پھوڑ کر اس کو متوجہ کیا:

"کیوں جماعہ دار، کچھ ملاقات کا بھی ڈھنگ نظر آتا ہے؟"

بس اس کو ڈپٹی کلکٹری کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر، مگر میں جانتا ہوں کہ ادب اور ڈر تو خاک نہیں، صرف اتنی بات کا لحاظ کہ شہر کی فوجداری سپرد ہے، خدا جانے کب موقع آپڑے، چار و ناچار اچٹتا ہوا سلام کر کے، جیسے کوئی مکھی اڑاتا ہے، اس کو کہنا پڑا کہ "آج ولایت کی ڈاک کا دن ہے، ملاقات تو شاید ہی ہو، لیکن آپ بیٹھیے، ابھی تو صاحب غسل خانے میں ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ پھر اندر کو جانے لگا تو آخر رہا نہ گیا، اور زبان سے نکلا کہ "کہاں بیٹھوں، اپنے سر پر؟" تب اس نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی، تکیہ اور ایک باز و ندارد، گویا بید کی تپائی، لا کر ڈال دی۔

اس کے بعد سے جب بھی چپراسی یا خدمت گار باہر آتا، یہی معلوم ہوتا کہ صاحب ابھی غسل خانے سے نہیں نکلے (الٰہی کیا غسل میت ہے)۔ اب کپڑے بدل رہے ہیں۔ اب میم صاحب کے کمرے میں ہیں۔ اب چٹھی لکھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر معلوم ہوا کہ کھانے کی میز پر ہیں۔ یہ سن کر جی ہی تو بیٹھ گیا کہ بس اب کیا خاک ملاقات ہوگی۔ ارادہ ہوا کہ گھر کی راہ لیں۔ پھر خیال ہوا کہ کون وقتوں سے انتظار کر رہے ہیں، آنا تو پڑے گا ہی۔ دوسرے دن کا کیا بھروسا۔ اتنی محنت کیوں ضائع کی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اور صبر کرو۔

بڑی دیر بعد چپراسی یہ حکم لے کر نکلا کہ سر رشتہ دار کو رپورٹ خوانی کے لیے بلایا ہے۔ اب رہی سہی امید اور بھی گئی گذری ہوئی۔ تب تو اپنا سا منہ لے کر چپراسی سے یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ "خیر، میں تو اب جاتا ہوں۔ صاحب سے میرے آنے کی اطلاع کر دینا۔" تب خدا جانے چپراسی کے دل میں کیا آئی کہ کہنے لگا، "میں دو بار آپ کی اطلاع کر چکا ہوں۔ کچھ بولے نہیں۔ اب پھر کہے دیتا ہوں، خفا ہوں

گے تو آپ میری آدھ سیر آٹے کی فکر رکھنا۔''

غرض، بلائے گئے۔صاحب کو دیکھا تو سر جھکائے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے ہیں۔اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کیوں کر ان کو خبر دار کروں کہ میں آیا ہوا کھڑا ہوں۔اور کیا معلوم ہے شاید جان بوجھ کر کھڑا رکھا ہو۔بلکہ مجھے تو اس بات میں بھی شبہ ہے کہ میرے آنے کی بہت دیر سے ان کو خبر تھی۔چپراسی نے شاید نہ بھی کہا ہو، مگر چاروں طرف آئینے کے کواڑ ہیں، عین سامنے کے دروازے سے آیا، درختوں کے نیچے ٹہلتا رہا، پھر بڑی دیر تک برآمدے میں بیٹھا رہا۔کیا اتنے عرصے میں ایک بار بھی ان کی نظر نہ پڑی ہوگی؟ ضرور پڑی ہوگی۔

خیر، آخر آپ ہی سر اٹھایا۔بندہ نوازی میں کچھ کمی نہیں کی، آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل میز کی دوسری طرف کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ کمبخت چپراسی نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کر کہا، ''خداوند۔سر رشتہ دار حاضر ہیں۔'' صاحب ہیں کہ میری طرف دیکھتے جاتے ہیں اور چپراسی سے فرما رہے ہیں:

''اچھا آنے بولو۔''

چودہ برس میں حضرت نے کیا کمال اردو میں حاصل کیا ہے۔سر رشتہ دار کے روبرو مجھ سے پوچھتے ہیں:

''ول صاحب، گرمی ہُوٹ؟''

میں نے گردن جھکا کر کہا:

''ہاں خداوند گرمی کے تو دن ہی ہیں۔میرے علاقے میں تو پولیس کی رپورٹ سے ایسا معلوم ہوا کہ لو سے بھی آدمی مرے۔''

میں تو سمجھا تھا کہ آدمیوں کا لو سے مرنا سن کر چونک پڑے گا اور ضرور پوچھے گا

کہ کس تھانے سے رپورٹ آئی، کتنے آدمی مرے؟ کب مرے؟ لوکا ہندوستانی کیا علاج کرتے ہیں، اور کوئی لاش ڈاکٹر صاحب کے ملاحظے کو بھی آئی یا نہیں۔ پر صاحب تو کچھ پی سے گئے۔ نہیں معلوم سمجھے یا نہیں، یا کالے آدمی کے مرنے کی پروا نہیں کی۔ جب سررشتہ دار کاغذ پھیلا کر لگا صاحب کا منھ دیکھنے، تو صاحب مجھ سے فرماتے ہیں،'' آپ کچ کچ...''، یعنی آپ کو کچھ اور کہنا ہے؟ یہ سنتے ہی میں تو یہ کہہ کر کھڑا ہوا کہ نہیں میں تو صرف سلام کے لیے حاضر ہوا تھا، بہت دن ہو گئے تھے جی ملنے کو چاہتا تھا، پھر حاضر ہوں گا۔

باہر نکلا تو چپراسیوں اور خدمت گاروں کا غول کا غول برآمدے میں موجود تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی سب نے فرشی سلام کیا۔ گھنٹوں برآمدے میں بیٹھا سوکھا کیا، ان میں سے کسی کی صورت بھی نظر نہیں پڑی، اب یہ حشرات الارض کہاں سے نکل پڑے۔ آہا! میں اتنی جاں فشانی کے بعد صاحب کو ایک سلام کر لینے کا گنہگار ہوں، یہ سرکاری پیادے اس کا جرمانہ وصول کرنے کے لیے مجھ پر تعینات ہیں۔ ❀❀

غور کرنے کی بات

ڈاکٹر نذیر احمد (1831 تا 1912) ہمارے سب سے بڑے ادیبوں میں ہیں۔ وہ سرسید کے بھی خاص دوست تھے۔ اگر چہ انھیں سرسید کی ہر بات سے اتفاق نہ تھا، لیکن ہندوستانیوں، خاص کر ہندوستانی مسلمانوں اور عورتوں کی تعلیم اور ترقی کے معاملے میں وہ سرسید کے پورے حامی تھے۔ انھوں نے اپنی لڑکیوں کے لیے تعلیمی قصے لکھے، مثلاً ''بنات النعش''، ''مرآۃ العروس''، جو اردو کے اولین ناول قرار دیے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی انھوں نے ناول لکھے جو اور بھی مشہور ہوئے، خاص کر ''توبۃ النصوح'' اور ''ابن الوقت''۔ ہمارا اقتباس ''ابن الوقت'' سے ہے۔ یہ ناول 1888 /1889 میں پہلی بار چھپا۔ اس میں انگریز افسروں اور ہندوستانی

ملازموں اور ہندوستانی افسروں کے آپسی تعلقات پر بہت دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ناول کا عام انداز انگریزوں کے موافق ہے، لیکن اس میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ہندوستانیوں سے انگریز افسران کا برتاؤ بہت توہین آمیز بلکہ ذلت آمیز تھا۔

سرسید احمد خان کے جن ساتھیوں نے اردو ادب کی عظیم خدمات انجام دیں ان میں مولانا محمد حسین آزاد، مولانا شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی کے ساتھ مولوی نذیر احمد کا بھی نام ہے۔ ایک مشہور ادیب مہدی افادی نے ان پانچ ادیبوں کو اردو ادب کے ''عناصر خمسہ'' یعنی Five Elements کہا تھا۔ مولوی نذیر احمد نے چھوٹے عہدے سے ترقی کر کے ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ حاصل کیا اور پھر حیدرآباد میں بھی بڑے عہدوں پر رہے۔ انھیں ڈپٹی نذیر احمد بھی کہا جاتا ہے۔

نذیر احمد کی نثر بھی ایسی ہے جیسے کوئی شخص باتیں کر رہا ہو۔ مشکل الفاظ بہت ہی کم، اور لہجے میں روانی ہے۔ لیکن دو باتیں ان کے یہاں اور بھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ دوسروں پر ہنستے ہیں، ان کے لہجے میں ظرافت کا نمک ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ وہ خود پر بھی ہنستے ہیں۔ یعنی یہاں وہ اس ہندوستانی افسر پر بھی ہنس رہے ہیں جو انگریز کلکٹر سے ملنے گیا ہے اور قدم قدم پر ذلیل ہوتا ہے۔ ساتھ ہی وہ انگریز کلکٹر اور اس کے نوکروں پر بھی ہنس رہے ہیں لیکن اس ہنسی میں تلخی اور غصہ بھی ہے۔ ظرافت کا لطف مولانا محمد حسین آزاد کے یہاں بھی ہے، لیکن خود پر، یا اپنے لوگوں پر ہنسنے کی ادا ان کے یہاں نہیں ہے۔

''لو'' (واوٴ معروف) یعنی پچھم سے بہنے والی گرم ہوا، دہلی میں اس کی جمع ''لوئیں'' بولتے ہیں۔ اور جگہ یہ رائج نہیں۔

''باوا'' بمعنی ''بابا'' = ''باپ'' دلی میں بولتے ہیں، اور جگہ رائج نہیں۔ لیکن پورا فقرہ ''اماں باوا'' دلی کے باہر بھی استعمال ہوتا ہے۔

پرانے زمانے میں انگریز افسر کو آئی۔سی۔ایس۔(.I.C.S) میں پہلا عہدہ اسسٹنٹ کمشنر Assistant Commissioner کا ملتا تھا۔ اس کے بعد انھیں جوائنٹ مجسٹریٹ Joint Magistrate بنایا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ District Magistrate بنتا

تھا۔ ہندوستانی لوگ ''جوائنٹ'' کو ''جنٹ'' اور جوائنٹ مجسٹریٹ کو ''جنٹ صاحب'' کہتے تھے۔ غیر آئی۔سی۔ایس مجسٹریٹ کو ''ڈپٹی کلکٹر'' یا ''ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر'' Extra Assistant Commissioner کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر یوریشین اور ہندوستانی ہوتے تھے۔ اصولی اعتبار سے آئی۔سی۔ایس اسسٹنٹ کمشنر کا درجہ تمام ڈپٹی کلکٹروں سے برتر ہوتا تھا۔

نذیر احمد نے ''شیطان کی انتڑی'' بمعنی کوئی بہت لمبی چوڑی چیز، جیسے لمبا راستہ، یا دالان وغیرہ، لکھا ہے۔ عام محاورہ ''شیطان کی آنت'' ہے، نذیر احمد نے دلی کا بہت بے تکلف محاورہ استعمال کیا ہے۔ ''انتڑی'' الگ سے بھی ''آنت'' (Intestine) کے معنی میں بولتے ہیں، لیکن کم۔

''لوٹتے وقت'' کے لیے نذیر احمد نے ''لوٹتے کو'' لکھا ہے، یہ اس وقت کی دہلی کی بولی ہے، اب زیادہ رائج نہیں۔

نذیر احمد نے ''منھ'' کو ''مونھ'' لکھا ہے۔ یہ دلی والوں کا املا ہے۔ بولنے میں واؤ کی جگہ حسب معمول صرف پیش کی آواز سنائی دیتی ہے، یعنی ''مونھ'' میں واؤ سے پیش کا کام لیا گیا ہے۔ اسے ''اعراب بالحرف'' کہتے ہیں، یعنی کسی حرف سے زیر، زبر، یا پیش کا کام لینا۔

فرھنگ

یوریشین = Anglo-Indian	ऐसा व्यक्ति / महिला जिसके मां या बाप में से एक अंग्रेज़ हो और एक हिन्दुस्तानी। यानी एक यूरोपीय और दूसरा एशियाई। ऐसे लोगों को एंग्लो–इंडियन कहते है।

پوئی =	The trot of a horse, also called پوئیہ	घोड़े की तेज़ रफ़्तार। इसे 'पोईया' भी कहते हैं।
دلکی =	A horse's easy and slow movement	घोड़े की हल्की रफ़्तार।
گانٹھ کا پورا =	Clever, intelligent; Now it means just the reverse: A fool, a stupid person	बुद्धिमान, चालाक। आजकल इसका अर्थ उलट गया है और अब बौड़म के अर्थों में प्रयुक्त है।
شاگرد پیشہ =	The servants' quarters, originally called" شاگرد پیشہ کے رہنے کی جگہ"; The word شاگرد originally meant, "servant". Similarly, "چیلا" means "servant" and Delhi's neighbourhood "کوچۂ چیلاں" was the neighbourhood where servants resided.	नौकरों के रहने की जगह। पहले यह 'शार्गिद पेशा के रहने की जगह' थी। 'शार्गिद' का वास्तविक अर्थ 'नौकर' है। इसी तरह 'चेला' का अर्थ भी नौकर है और दिल्ली का 'कूचा चेलान' वह मुहल्ला था जहां नौकर लोग रहते थे।

پیشی کا بستہ =	Cloth folder or portfolio in which official papers were kept and submitted to an officer at the proper time	वह बस्ता / थैला जिसमें सरकारी काग़ज़ रखे जाते और अवसर आने पर अफ़सर को दिए जाते थे।
مقطع =	With hair and beard trimmed properly	सिर और दाढ़ी के बाल ठीक से बनवाए हुए।
فرش =	Something to be spread on the ground for seating people, for example, a carpet	ज़मीन पर बिछाने और बैठने की कोई च़ीज़ जैसे क़ालीन।
چکھوتی =	A small tip by way of gratification, bakhsheesh	थोड़ा सा इनाम जो रिश्वत या बख़्शिश के तौर पर मिले।
اردلی =	Orderly	वह चपरासी जो अफ़सर के घर पर रहे।
جماعدار =	A senior domestic servant	जमादार
فوجداری =	Matters that pertain to physical hurt; Court where such matters are heard	वे बातें जो मारपीट या शरिरिक हानी से सम्बन्ध रखती हों, और वह अदालत जहां ऐसे मुक़दमें सुने जाएं।

غسل میت =	Washing and bathing a body before burial	मुर्दे को दफ़न करने से पहले नहलाना।
تکیہ =	Back of chair	कुर्सी की पीठ।
آدھ سیر آٹے کی فکر رکھنا =	The peon is pretending that he is taking a risk in informing the Sahib about the visitor, and he may lose his job if the Sahib is angry at him. So he asks the visitor to care provide replacement job if he loses this one	नौकरी दिलवाने का ख़्याल रखना। (चपरासी बात बनाकर कहता है कि आपके आने की ख़बर कर दूं, और साहिब ने अगर नाराज़ होकर मुझे निकाल दिया तो आप मुझे दुसरी नौकरी दिलवाने का ख़्याल करना।)
سررشتہ دار =	An officer of the court or the administration empowered to receive applications	न्यायालय या प्रशासन का अफ़सर जिसके यहां याचिकाऐं जमा की जाती हैं।
آئینہ =	Glazing	शीशा, दर्पण।
بندہ نوازی =	To show kindness to someone who is inferior	अपने से छोटे / निम्न स्तर के व्यक्ति पर मेहरबानी क़रना।
خداوند =	Master	मालिक, स्वामी।

حشرات الارض =	Creeping insects, especially those that live below ground	कीड़े–मकौड़े, विशेषत: वे जो भूमि के अन्दर रहते हैं।
آہا =	What a pity!	अफ़सोस

کامیابی کا قرآنی راستہ

مولانا ابوالکلام آزاد

میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی بھی دنیا کا کوئی وجود، کوئی روح، کوئی آتما، بلکہ کوئی ذرہ اس آسمان کے نیچے جگہ نہیں پا سکتا، جب تک وہ اس پروگرام پر عمل نہ کرے جو قرآن نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

قرآن نے اس بارے میں نہایت تفصیل سے بیانات دیے ہیں، لیکن ایک بہت ہی چھوٹا سا بیان بھی ہے، جس کی نسبت تاریخ اسلام کے ایک بہت بڑے امام نے، جن کا نام امام شافعی ہے، کہا تھا کہ اگر قرآن کے صرف یہی چند جملے نازل ہو جاتے تو تمام کرۂ ارضی کی ہدایت کے لیے کافی تھے۔ آپ کی تحریک خلافت، ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے۔ یہ ایک مقصد ہے، جو فتح چاہتا ہے، عمل چاہتا ہے۔ تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن کا ہر اچھے مقصد کے لیے یہ اعلان ہے کہ اس آسمان کے نیچے نوع انسان کے لیے، انسان کی تلاش، جستجوؤں، امیدوں کے لیے بڑی بڑی ناکامیاں ہیں۔ بڑے بڑے گھاٹے، ٹوٹے ہیں۔ لیکن دنیا کی اس عام نامرادی سے کون انسان ہے، کون جماعت ہے، جو بچ سکتی ہے، ناکامیابی کی جگہ کامیابی پا سکتی ہے، ناامیدی کی جگہ امید اس کے دل میں اپنا آشیانہ بنا سکتی ہے؟ وہ کون انسان ہے؟ یہ وہ انسان ہے، جو دنیا میں ان چار شرطوں کو قولاً اور عملاً اپنے اندر

پیدا کرے۔ جب تک یہ شرطیں پیدا نہ ہوں گی دنیا میں نہ کوئی قوم کامیاب ہوسکتی ہے نہ ملک، حتیٰ کہ ہوا میں اڑنے والا پرند بھی دنیا میں کامیابی نہیں پاسکتا۔

ان چار شرطوں کے نام سے گھبرا نہ جانا۔ اگر یہ چیز عربی بھیس میں آجائے، تو کیا تم انکار کر دو گے، چاہے وہ پہچانی ہوئی ہو؟

پہلی شرط وہ ہے جس کا نام قرآن مجید کی بولی میں ''ایمان'' ہے۔ تم جب ہی کامیابی پاسکتے ہو، جب تمھارے دلوں کے اندر، روح کے اندر وہ چیز پیدا ہوجائے، جس کا نام قرآن کی بولی میں ایمان ہے۔ عربی میں ''ایمان'' کے معنی ہیں ''زوال شک''، یعنی کامل درجے کا بھروسا اور علم۔ کامل درجے کا اقرار تمھارے دلوں میں پیدا ہوجائے۔ جب تک کامل درجے کا یقین تمھارے دلوں میں نہ پیدا ہو، اللہ کی صداقت پر، اللہ کی سچائی پر، اللہ کے اصولوں پر، جس وقت تک کامل درجے کا یقین تمھارے قلب کے اندر پیدا نہ ہوگا، کامیابی کا کوئی دروازہ نہیں کھل سکتا۔ شک کا اگر ایک کانٹا بھی تمھارے دل میں چبھ رہا ہے، تو تمھیں اپنے اوپر موت کا فیصلہ صادر کرنا چاہیے۔ تم کو کامیابی نہیں ہوسکتی۔ سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ تمھارے اندر ایمان، یقین، اطمینان، جماؤ، تمکین اور اقرار پیدا ہو۔

لیکن کیا محض دل کا یہ کام، دماغ کا یہ فعل، تصور کا یہ نقشہ، کامیابی کو پورا کر دے گا؟ نہیں۔ ایک دوسری منزل بھی اسی کے بعد آتی ہے۔ جب تک وہ دوسری منزل بھی کامیابی کے ساتھ طے نہ کرلو گے اس پہلی منزل کو طے کر کے کامیابی نہیں پاسکتے۔ اس دوسری منزل یا شرط کا نام قرآن مجید کی بولی میں ''عمل صالح'' ہے، یعنی وہ کام جو اچھا ہے، جسے اچھائی کے ساتھ کرنا، سچائی اور صحیح طریقے سے انجام دینا ہے۔

ایمان کے معنی ہیں، وہ یقین، وہ کامل اطمینان، وہ کامل اقرار، جو عمل سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔ جس وقت یہاں اس کانفرنس کی جگہ ایک چٹیل میدان تھا، کوئی وجود اس شامیانے کا نہ تھا۔ صرف تمھاری خلافت کمیٹی کے ارکان تھے، مگر اس وقت بھی یہ شامیانہ ان چمکتی ہوئی لالٹینوں کے ساتھ موجود تھا۔ کہاں؟ تمھارے ارکان کے دماغ میں! وہ چیز جو ان کے دماغوں میں موجود تھی، وہ ارادہ، جو ان کے ذہن میں پیدا ہوا تھا، پہلی منزل ہوئی، جو مذہب میں آکر "ایمان" کا نام اختیار کر لیتی ہے۔ پہلی چیز عملِ دماغ ہے۔ یہ عمل، تصور و یقین ہے۔ اس بنا پر سب سے پہلی منزل ایمان کی ہے، پہلی چیز یہ ہے کہ تمھارے دل کے اندر سچا ارادہ پیدا ہو، سچا عزم پیدا ہو۔ دوسری منزل عمل الصالحات کی ہے۔ صرف دماغ کی منزلیں طے کر کے قدم نہ رک جائیں بلکہ عمل بھی کرو، وہ عمل، جو صالح ہو، جو صحیح طریقے پر ہو۔ جب اس کو پورا کر لیا، تو معنی یہ ہوئے کہ فتح مندی اور کامیابی کی دو منزلیں تم نے طے کر لیں۔

مگر کیا تمھارا کام ختم ہو گیا؟ اس کے بعد کیا تم منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے؟ قرآن مجید کی عالمگیر صداقت بتاتی ہے کہ نہیں، دو منزلوں کے بعد دو منزلیں اور بھی باقی ہیں۔ اپنی ہمت کو آزماؤ کہ ان کے لیے تمھارے تلوے تیار ہیں یا نہیں؟ تمھاری کمر ہمت مضبوط ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو ممکن ہے کہ یہ دو منزلیں تمھارے لیے سودمند نہ ہوں۔ وہ منزلیں یہ ہیں: قرآن مجید نے فرمایا کہ ایمان اور عمل صالح آدمی کے اندر پیدا ہوا، یعنی یہ ہوا کہ انسانیت کی جو ایک زنجیر ہے، اس کی ایک کڑی نے اپنے آپ کو درست کر لیا۔ لیکن کیا ایک کڑی کے درست کر لینے کے بعد زنجیر کا پورا کام ہو گیا۔ ہرگز نہیں۔ تم کیا ہو؟ افراد کا مجموعہ، بکھری ہوئی کڑیوں کا ڈھیر۔ قرآن وجود مانتا ہے اجتماع کا، قوم کا۔ اس کے نزدیک وجود کڑیوں کا نہیں بلکہ زنجیر کا ہے۔

تم میں سے ہر وجود ایک کڑی ہے۔ اس کا کام پورا نہیں ہوسکتا جب تک وہ باقی کڑیوں کی خبر نہ لے۔ جب تک باقی کڑیاں مضبوط نہ ہوں گی، زنجیر مضبوط نہیں ہوسکتی۔ اس لیے فرمایا کہ کامیابی کا سفر کامیاب نہیں ہوسکتا، جب تک تیسری منزل تمھارے سامنے نہ آئے۔ وہ تیسری منزل فصیح و بلیغ لفظوں میں'' تواصی بالحق و تواصی بالصبر'' ہے۔ یعنی تم جو ایک کڑی تھے، تم نے ایمان کی مضبوطی سے اسے سنوار لیا، لیکن تمھارا کام ختم نہیں ہوا، تمھارا فرض ہے کہ دوسری کڑیوں کو بھی درست کرو، اور انھیں اس طرح درست کر سکتے ہو کہ جس سچائی کو تم نے اپنایا ہے، اسے دوسروں میں بھی پھیلاؤ۔ جب تک تم میں یہ بات نہ ہوگی کہ تمھارا دل سچائی کے اعلان کے لیے تڑپنے لگے، جب تک تم تواصی حق نہ کروگے اس وقت تک کامیابی تمھیں مل نہیں سکتی۔

لیکن اگر اس تیسری منزل کے لیے تم تیار ہو گئے، تو اگر توفیق الٰہی نے تمھاری دستگیری کی، تو پھر آخری منزل کون ہے؟ وہ منزل وہ ہے جو صبر کی منزل کے لیے لازم وملزوم ہے۔ اس کے ساتھ اس کی گردن اس طرح جکڑی ہوئی ہے کہ جدا نہیں کی جاسکتی۔ فرمایا، حق کی وہ تواصی کریں گے، حق کا پیام سنائیں گے۔ حق کی دعوت پہنچائیں گے، مگر حق کا یہ حال ہے کہ اس کی راہ میں کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا، جب تک وہ قربانیوں کے لیے بھی نہ اٹھے۔ فرمایا کہ صرف حق کا پیام ہی مومن نہ پہنچائے۔ بلکہ صبر کا بھی پہنچائے۔

تم نے اپنی بدبختی سے نہ صرف شریعت کے حکم کو بدلا ہے، بلکہ اپنے طریق عمل سے شریعت کے لفظوں کو، بولیوں کو بھی بدل ڈالا ہے۔ ''صبر'' کے معنی کیا ہیں؟ تم سمجھتے ہو کہ صبر کے معنی ہیں بے غیرتی اور باطل کی پرستش اور پوجا۔ تم صبر کے معنی یہ سمجھتے ہو! لیکن جو شخص صبر کے یہ معنی سمجھتا ہے، اس سے بڑھ کر قرآن مجید کی تحریف

لفظی کرنے والا کوئی نہیں۔ اگر صبر کے معنی یہ ہیں کہ تمھارے حق کے مقابلے میں مصیبت آجائے، تو تم صبر کے گوشے میں پناہ لو، یعنی ہر طرح کی بے غیرتی کو، بے چارگی کو، باطل پرستی کو قبول کرلو، تو میرے بھائیو، تم سے بڑھ کر قرآن کی تعلیم کو بدلنے والا کوئی نہیں۔

صبر کے معنی اس سے بالکل مختلف ہیں۔ صبر کے معنی ہیں برداشت کے، جھیلنے کے، عمل کے، جو تم مقصد کی راہ میں اپنے محبوب اور پیارے مقصد کے لیے اٹھاؤ۔ اور اس میں طرح طرح کی مصیبتیں آئیں، طرح طرح کی ڈراؤنی صورتیں آئیں، زنجیریں اور ہتھکڑیاں آئیں، بلکہ ممکن ہے کہ تمھارے سامنے تختہ آئے اور اس پر ایک پھندا جھول رہا ہو۔ یہ سب تمھارے سامنے آسکتا ہے، لیکن اگر تم حق کے پرستار ہو، تو تمھارا فرض ہونا چاہیے کہ تمھارے اندر صبر ہو، تمھارے اندر برداشت کی وہ اٹل طاقت، برداشت کا وہ پہاڑ موجود ہو، جس پر دنیا کی کوئی شوکت، کوئی تاج و تخت فتح یاب نہ ہو سکے، یہ معنی صبر کے ہیں۔

❋❋

غور کرنے کی بات

مولانا ابوالکلام آزاد (1888 تا 1958) ہندوستان کے عظیم ترین فرزندوں میں تھے۔ وہ ایک ہی وقت میں اسلامیات کے بہت بڑے عالم، مذہبی رہنما، ہماری جنگ آزادی کے بہت بڑے سیاسی رہنما، اور اردو کے اعلیٰ درجے کے نثر نگار اور مقرر تھے۔ ان کی نثر میں عام طور پر تقریر کا زور ملتا ہے۔ زیر نظر تحریر، جو ہم نے مولانا ابوالکلام آزاد کے پرانے دوست عبدالرزاق ملیح آبادی کی کتاب "ذکر آزاد: مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ چالیس سال" سے اخذ کی ہے، ایک تقریر ہے جو مولانا نے تحریک خلافت کے زمانے میں عام مجمعے کے درمیان کی تھی۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مولانا نے قرآن شریف کی بعض باتوں کا کتنا عمدہ مطلب بیان کیا ہے اور یہ مطلب

ان کے سیاسی مقصد کو بیان کرنے میں کس قدر کارآمد ہے۔ مولانا کا انداز بالکل عالموں جیسا ہے لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر بات کو عام لوگوں کی سمجھ کے مطابق بنا کر بیان کر رہے ہیں۔ یہ ان کی تقریروں کی بہت بڑی خوبی ہے۔

وہ عام طور پر عربی فارسی کے الفاظ بہت استعمال کرتے تھے۔ لیکن تقریر کے موقعے پر، جب ان کے سامنے کم پڑھے لکھے لوگ بھی ہوتے تھے، وہ سادہ زبان استعمال کرتے تھے اور تقریر کا تقاضا پورا کرنے کے لیے وہ جملے دہراتے بھی تھے تاکہ بات سب کے دل میں پوری طرح اتر جائے۔

غور کیجیے کہ مولانا نے ''ایمان'' اور ''صبر'' کو عام ڈھرے سے ہٹ کر ایسے معنی دیے ہیں کہ ایمان اور صبر اختیار کرنے والا شخص صاحب عمل انسان بن جائے۔

یہ تقریر ''تحریک خلافت'' کے بارے میں ہے۔ ''خلافت'' سے مراد ملک ترکی (Turkey) میں عثمانی خاندان کی حاکمیت ہے۔ عثمانی ایک مدت سے اسلامی دنیا کے ایک بہت بڑے حصے کے حاکم تھے اور عثمانی سلطان کو ''خلیفہ'' کہا جاتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم (1914 تا 1918) میں برطانوی سامراج نے جرمنی اور اس کے ساتھی ترکی کو شکست دی تو انگریزوں نے اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ترکی کی حکومت ختم کر کے اسلامی ممالک پر مغربی طاقتوں کا اختیار قائم کرنے اور ترکی کی خلافت کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مولانا محمد علی، مولانا آزاد، مہاتما گاندھی، اور دوسرے رہنماؤں نے ہندوستان کے تمام لوگوں، ہندو اور مسلمان، کو متحد کر کے ''تحریک خلافت'' چلائی اور انگریزوں سے کہا کہ وہ عثمانی سلطان کی خلافت کو ختم نہ کریں۔ 1920 کی دہائی میں یہ تحریک بہت زور وشور سے پھیلی، لیکن انگریز اپنی سی کر کے رہے۔

فرھنگ

نازل ہونا =	To come down, especially in the form of a revelation	किसी वस्तु का नीचे उतरना, विशेषतः ख़ुदाई पैग़ाम/देव–वाणी या खोज के रूप में।
کرۂ ارضی =	The earth as a globe; the terrestrial globe	पृथ्वी का गोला, पृथ्वी जो गेंद जैसी है।
نوعِ انسان =	The human race	वे तमाम जीव जो 'इंसान' कहलाते हैं। मानव जाति।
قولاً وعملاً =	With word and deed	बातों और कार्यों, दोनों से। शब्द और कर्म से।
حتیٰ کہ =	To the extent that	यहां तक कि
زوال =	Decline	पतन
کامل =	Perfect	पूर्ण, हर प्रकार से पूर्ण
تمکین =	Self-control; Dignity	स्वयं को क़ाबू में रखना, प्रतिष्ठा, गरिमा
ارکان =	Members; plural of رکن	'रुक्न' का बहुवचन। सदस्य।
عالمگیر صداقت =	Universal truth	सार्वभौमिक सत्य
عمل الصالحات =	Act of goodness	अच्छे काम

فصیح و بلیغ لفظ	Chaste and eloquent language as used by competent native speakers; language free from unusual words; language as required by the occasion, and in such a way as to convey the intended sense	ऐसे शब्द जिनको किसी भाषा के बोलने वाले लोग सामान्यतः बोलते हैं। ऐसी बातें जिनमें अनूठापन न हो, जो अवसर उपयुक्त हों और अर्थ तक पहुंचाने में पुरी तरह सक्षम हों।
تواصی بالحق =	To advise and instruct each other to be true	सच्चाई और सच्चाई पर डटे रहने के लिए एक दूसरे को नसीहत करना।
تواصی بالصبر =	To advise and instruct each other to have patience	सांत्वना देने के लिए एक दुसरे को नसीहत करना।
دستگیری =	Help	मदद, सहायता।
لازم و ملزوم =	Inseparable; reciprocal; two things essential for each other	दो वस्तुऐं जो एक दूसरे के होने के लिए आवश्यक हों/लाज़िम हों।
باطل =	False; the opposite of true	झूठ, झूठी वस्तु
تحریف لفظی =	To change or distort the words so as to change the meaning	शब्दों को बदलना या बिगाड़ना, इस तरह कि अर्थ बदल जाऐ।

بے غیرتی = Absence of the sense of shame and self-respect निर्लज्जता, बेशर्मी।

ملحوظ رہے کہ "تواصی بالحق" اور "تواصی بالصبر" کے فقرے قرآن پاک کی سورۂ عصر (تیسواں پارہ) پر مبنی ہیں۔

ध्यान रहे कि تواصی بالحق और تواصی بالصبر के वाक्यांश कुरान पाक की सूरा–ए–अस्र (तीसवां पारा) पर आधारित है।

ارتقا کا نظریہ اور مسلمان فلاسفہ

شبلی نعمانی

موجودات کے جو انواع ہیں، ان میں سے ہر ایک کی ہزاروں قسمیں ہیں جن کو سب لوگ ایک ہی نوع شمار کرتے ہیں، مثلاً کبوتر، گھوڑے وغیرہ، اوران کی قسمیں۔ ایک قسم ترقی کر کے دوسری قسم میں داخل ہو جاتی ہے۔

جمادات، نباتات، حیوانات، ان میں سے ہر ایک کی ترقی یافتہ قسمیں اوپر کی نوع سے مل جاتی ہیں۔ یعنی جماد میں نمو پیدا ہو جاتا ہے، اس لیے وہ نبات کہلایا جا سکتا ہے۔ نبات میں ارادی حرکت پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے اس کو حیوان کہہ سکتے ہیں۔ حیوانات میں عقل و ہوش اور ادنیٰ درجے کا تمدن پیدا ہو جاتا ہے۔

مندرجہ بالا امور تو قطعی ثابت ہو چکے ہیں۔ اب گفتگو صرف یہ رہ جاتی ہے کہ عام لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا جب پیدا ہوئی تو جمادات، نباتات، حیوانات، سب ایک زمانے میں پیدا ہوئے اور الگ الگ پیدا ہوئے۔ ڈارون (Darwin) کی رائے ہے کہ پہلے صرف نوع پیدا ہوئی، وہی ترقی کرتے کرتے انسان کی حد تک پہنچ گئی۔

یہ ظاہر ہے کہ ان دو احتمالوں میں سے کوئی قطعی نہیں۔ یوں بھی ہو سکتا ہے اور ووں بھی۔ اس لیے اتنا تو بہر حال مان لینا چاہیے کہ ڈارون جو کچھ کہتا ہے وہ ایسی چیز

نہیں کہ جس کی ہنسی اڑائی جائے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ دونوں احتمالوں میں سے زیادہ قرین قیاس کون ہے اور روزمرہ کے تجربے کیا شہادت دیتے ہیں؟ یہ ظاہر ہے کہ ہم دن رات دیکھتے رہتے ہیں کہ تمام چیزیں ترقی کرتی رہتی ہیں۔گلاب کی صرف دو تین قسمیں تھیں،آج کئی سو قسمیں ہیں۔جن پھولوں میں سو سو پتیاں ہوتی تھیں کئی کئی ہزار تک پہنچیں۔آب و ہوا،موسم اور ملکی ترقی نے جانوروں کے اقسام کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔یہ بھی آنکھوں سے نظر آتا ہے کہ اعلیٰ قسم ابتداً خود بخود نہیں پیدا ہوئی،بلکہ وہی ادنیٰ چیز ترقی کرتے کرتے اعلیٰ بن گئی۔خود ہم نے ایک ادنیٰ چیز کو ترقی دے کر ادنیٰ سے اعلیٰ کر دیا۔اسی طرح،فطرتاً ادنیٰ چیزیں اعلیٰ ہوتی رہتی ہیں۔اس بنا پر بھی زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ جمادات،نباتات،حیوانات بھی اسی طرح ترقی پا کر ایک نوع سے دوسری نوع ہوتی گئی۔

<u>حکمائے اسلام کا اس کے متعلق خیال</u>

اخوان الصفا کے رسالوں میں اس بحث کو تفصیل سے لکھا ہے۔ہم جستہ جستہ مقامات سے اس کا اقتباس کرتے ہیں:

> جمادات کا انتہائی درجہ نباتات سے ملا ہوا ہے۔نباتات کا انتہائی درجہ حیوانیت کے ابتدائی درجے سے متصل ہے اور حیوانیت کا انتہائی درجہ،انسانیت کے ابتدائی درجے سے ملا ہوا ہے۔نر کھجور اور مادہ کھجور کے درخت ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے ہیں۔نر کھجور،مادہ کھجور کو حاملہ کرتا ہے،جیسا کہ حیوانات میں ہے۔ثابت ہوا کہ کھجور جسم کے لحاظ سے نبات ہے اور نفس کے اعتبار سے حیوان ہے کیونکہ اس کے افعال حیوانات کے افعال ہیں۔نباتات میں

صرف قوت لامسہ ہوتی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نباتات اپنے ریشوں کو مرطوب زمین کی طرف جانے دیتے ہیں اور پتھریلی اور خشک زمین کی طرف جانے سے روکتے ہیں۔ کوئی گھانس اگر کسی تنگ جگہ میں اگتی ہے تو ہٹ کر کسی دوسری طرف رخ کرتی ہے اور وسیع جگہ تلاش کرتی ہے۔ سب سے کم درجے کا حیوان وہ ہے جس کے صرف ایک حاسہ ہوتا ہے۔ اس کے کان، آنکھ، شامہ، ذائقہ، کچھ نہیں ہوتا، صرف چھونے کی حس ہوتی ہے۔ چنانچہ اکثر کیڑے جو مٹی میں اور دریاؤں کی تہ میں پیدا ہوتے ہیں، اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

علامہ ابن مِسکَوَیہ، متوفیٰ 441 ہجری، نے بھی اپنی کتاب ''الفوز الاصغر'' میں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ لیکن ابن مسکویہ کائنات کا سلسلہ نباتات سے شروع کرتا ہے:

سب سے ادنیٰ درجے کا نبات جب زمین سے اگتا ہے تو وہ تخم کا محتاج نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ تخم کے ذریعہ اپنی نوع کی حفاظت کرتا ہے، جیسے گھانس۔ اور یہ جماد کا آخری درجہ ہے۔ اس قسم کے نباتات اور جمادات میں تھوڑی سی حرکت کا فرق ہے۔ یہ قوت بڑھنی شروع ہوتی ہے، یہاں تک کہ اس کی شاخیں ہوتی ہیں، پھیلتا ہے، تخم کے ذریعہ اپنی حفاظت کرتا ہے۔ یہ قوت بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ درخت پیدا ہوتے ہیں جن کے تنے، پتیاں، پھل ہوتے ہیں، جن سے وہ اپنی نوع کی حفاظت کرتے ہیں۔ نبات

جب اپنی منزل سے آگے بڑھتا ہے تو اس کا پہلا زینہ یہ ہے کہ زمین سے الگ ہو جائے اور اس کو اس کی ضرورت نہ رہے کہ اس کی جڑیں زمین میں گڑی رہیں۔ اس میں ابھی ایک ہی قسم کا حاسہ پیدا ہوا ہے، یعنی چھونے کی قوت۔ پھر حیوان آگے بڑھتا ہے، یہاں تک کہ اس میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے، قوت احساس زیادہ ہوتی ہے۔ پھر ترقی کرتا ہے اور اس پر فیضان روح زیادہ ہوتا ہے۔ پھر ایک زینہ اور قدم رکھتا ہے اور اس میں تھوڑی سی بصارت پیدا ہوتی ہے جیسے چیونٹی اور شہد کی مکھیاں۔ پھر آگے بڑھتا ہے، یہاں تک کہ حیوان کامل الحواس پیدا ہوتے ہیں۔ عقل انسانی کو قبول کرنے کی ان میں صلاحیت ہوتی ہے جیسے چوپایوں میں گھوڑا اور پرندوں میں باز۔ پھر حیوان ترقی کر کے انسان کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کا قد سیدھا ہو جاتا ہے، اس میں تھوڑی سی تمیز کی قوت آ جاتی ہے۔

نظامی عروضی سمرقندی جو چھٹی صدی کا ایک بلند پایہ حکیم ہے، اپنی تصنیف ''چہار مقالہ'' میں اس مسئلے کی تشریح اس طرح کرتا ہے:

جس قدر حاسے کم ہوں گے اتنا ہی کم اور ناقص وہ حیوان ہو گا۔ جیسے سانپ کے کان نہیں ہوتے، چیونٹی کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔ لیکن کیچوے سے زیادہ کوئی ناقص حیوان نہیں ہوتا۔ کیچوا ایک قسم کا کیڑا ہے جو دریا کی مٹی میں پیدا ہوتا ہے۔ حیوانیت کا ابتدائی نمونہ کیچوا ہے، اور انتہائی بن مانس۔ بن مانس ترکستان کے

صحرا میں ایک قسم کا جانور ہوتا ہے جس کا قد سیدھا، ناخن چوڑا ہوتا ہے۔ بن مانس انسان کے بعد تمام حیوانات سے ترقی یافتہ ہے۔

❀❀

غور کرنے کی بات

علامہ شبلی کی یہ تحریر ہم نے ''مقالات شبلی''، جلد ہفتم کے ایک مضمون سے اخذ کی ہے۔ یہ مضمون سو برس سے بھی زیادہ پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ شبلی نہ صرف یہ کہ نئے خیالات سے واقف تھے، بلکہ ان سے ہمدردی رکھتے تھے اور ڈارون کے نظریۂ ارتقا پر بحث کرتے وقت انھوں نے یہ کہیں نہیں کہا ہے کہ مذہب اسلام اس کے خلاف ہے۔ انھوں نے یہ کہا ہے کہ ڈارون کا نظریہ بھی ایک احتمال پیش کرتا ہے، جیسے کہ اور بھی احتمالات ہیں، اور اس کی وجہ کوئی نہیں کہ ہم اسے ہنسی میں اڑا دیں۔ آج تمام سائنس اس بات پر متفق ہے کہ تمام سائنسی اصول صرف احتمالی طور پر درست ہیں اور نئے حقائق کے معلوم ہونے پر یہ اصول بدل بھی سکتے ہیں۔ شبلی نے یہ بات سو برس پہلے کہی، جیسا کہ ہم یہاں دیکھتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ شبلی نے بتایا ہے کہ آج سے ہزار برس پہلے کے مسلمان فلسفیوں نے ایسے تصورات پیش کیے ہیں جن کو ڈارون اور دوسرے سائنس دانوں نے بعد میں بہت پھیلا کر پیش کیا اور وہ تمام دنیا میں مقبول ہو گئے۔ یہ بات صحیح ہے کہ ارتقا کے بارے میں شبلی، اور عہد قدیم کے مسلمان سائنس دانوں کے خیالات ذرا سادہ اور سہل ہیں، لیکن انھوں نے اس باب میں تقریباً تمام ضروری باتیں بیان کر دی ہیں۔

یہ بھی غور کیجیے کہ شبلی اور دیگر مفکرین نے اتنے مشکل خیالات کو کس قدر آسان زبان میں پیش کیا ہے۔ شبلی کی نثر، علمی نثر کی بہترین مثال ہے، آسان، رواں، بالکل واضح اور تکرار سے خالی۔ شبلی کی اپنی نثر جتنی شگفتہ اور رواں ہے اتنا ہی رواں اور سلیس ان کا عربی اور فارسی سے ترجمہ ہے۔ یہ پورا مضمون بالکل افسانے کی طرح لطف لے کر پڑھا جا سکتا ہے۔

چارلس ڈارون(Charles Darwin)(1809-1882)انگریز سائنس داں تھا۔
اس نے ارتقا(Evolution) کے نظریے کو اپنی دو کتابوں The Origin of Species اور The Descent of Man میں بہت مضبوط استدلالوں اور ثبوتوں کی روشنی میں بیان کیا۔

گہری سائنسی اور فلسفیانہ فکر رکھنے والے کچھ لوگوں نے بصرہ میں 990 کے آس پاس ایک نیم خفیہ سوسائٹی اخوان الصفا نام کی قائم کی تھی۔ یہ لوگ سائنس اور فلسفہ اور مذہب کے تمام مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے اور ان پر مضامین لکھتے تھے۔ ان کی جو تحریریں موجود ہیں انھیں ''رسائل اخوان الصفا'' کہا جاتا ہے۔

شبلی نے ''گھاس'' کی جگہ ''گھانس'' لکھا ہے۔ یہ اس زمانے کا عام تلفظ تھا، دلی میں اب بھی عام ہے۔ہاں ''گھانس پھونس'' اب بھی ہر جگہ بولا جاتا ہے۔

ابن مسکویہ [میم پر زیر ہے، کاف اور واؤ پر زبر] نے سائنس کے علاوہ روح اور اخلاق پر بھی لکھا ہے۔ سچ پوچھیے تو اس زمانے میں سائنس الگ سے کوئی علم نہ تھا۔ ''حکیم'' یعنی عقل اور علم رکھنے والا شخص ہر موضوع کا ماہر ہوتا تھا۔

نظامی عروضی سمرقندی نے اور بہت کچھ لکھا ہے، لیکن اس کی کتاب ''چہار مقالہ'' جس میں فلسفہ بھی ہے اور ادبی تنقید بھی، بہت مشہور ہوئی۔

فرہنگ

موجودات=	All that exists in the skies and on the earth	पृथ्वी और आकाश में जो कुछ है उसको मौजूदात कहते हैं।
انواع=	Category; Class; Plural of نوع	'नौ' का बहुवचन। वे चीज़ें जो एक ही तरह की हों लेकिन थोड़ी बहुत भिन्न हों, 'एक ही नौ' की कही जाती हैं।

جمادات=	Stone, and things of that category	पत्थर और उसकी नौ की चीज़ें।
نباتات=	Vegetation, and things of that category	बनास्पति
حیوانات=	Living things	जानदार चीज़ें।
تمدن=	Culture, and methods and systems of living in a society	सभ्यता, लोगों का आपस में मिलकर रहने का व्यवस्थातन्त्र
امور=	Plural of امر, Things to do, issues to be tackled	'अम्र' का बहुवचन। बातें, मामले इत्यादि।
لامسہ=	The sense of touch	लम्स या छूने की शक्ति।
مرطوب=	Damp	नम, आद्र
شامّہ=	The sense of smell	सूंघने की क्षमता
ذائقہ=	The sense of taste	चखने की क्षमता
حاسّہ=	The sense of experiencing things	महसूस करने की क्षमता।

دیاسلائی

خواجہ حسن نظامی

آپ کون؟

ناچیز تنکا۔

اسم شریف؟

دیاسلائی کہتے ہیں۔

دولت خانہ؟

جناب دولت ہے نہ خانہ۔ اصل گھر جنگل ویرانہ تھا، مگر چند روز سے احمد آباد میں بستی بسائی ہے۔ اور سچ پوچھیے تو یہ ننھا سا کاغذی ہوٹل، جس کو آپ بکس کہتے ہیں اور جو آپ کی انگلیوں میں دبا ہوا ہے، میرا موجودہ ٹھکانا ہے۔

یہ احمد آباد ناروے یا سویڈن کے پاس کوئی نیا مقام ہے؟ کیونکہ آپ کی بستیاں تو انھیں علاقوں میں سنی جاتی ہیں۔

نہیں جناب، احمد آباد ہندوستان میں ہے۔ آپ دیکھتے نہیں میری رنگت کالی ہے۔ یہ اسی ملک کی نشانی ہے، ورنہ ناروے سویڈن کی دیاسلائی گوری چٹی ہوتی ہے۔ مجھ غریب کو اس سے کیا نسبت؟

آہا، تو آپ ہمارے ملک کی دیاسلائی ہیں، تب تو گو آپ کا رنگ سانولا ہے

مگر ہماری نگاہ میں سب دیا سلائیوں کی رانی ہو۔

ذرا مہربانی کر کے مجھ کو رانی نہ فرمائیے، بیگم کہیے۔ میں نے مسلمانوں کے گھر میں جنم لیا ہے۔ منشی فتح خاں نے مجھے بنایا ہے۔

بہت اچھا میاں تنکے، ناراض نہ ہو۔ اللہ اکبر، تم کو بھی یہ دن لگے کہ رانی اور بیگم میں تمیز کرتے ہو۔ کے آمدی کے پیر شدی۔ وہ وقت بھول گئے جب زنجیروں میں باندھ کر آرے کے نیچے رکھے جاتے تھے اور آرہ آن کی آن میں تمھارے ٹکڑے کر ڈالتا تھا۔ اس کے بعد جیسی گت بنتی تھی، تم خود خیال کر کے گریبان میں منھ ڈال سکتے ہو۔ تمھارے تراشیدہ کندوں کا ظلماتی چشمے میں ڈالا جانا اور اس کھولتے ہوئے پانی میں تمھارا تلملانا، کبھی سطح آب پر آنا، کبھی تہ میں چلا جانا، یہاں تک کہ اسی گیرودار اور پیچ و تاب میں تمھاری کھال تک اتر جاتی تھی۔ اس وقت کچھ دیر کے لیے تم کو باہر نکال کر دم دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد پھر مشین میں کس دیا جاتا تھا اور مشین چھیل چھیل کر تمھارے لمبے لمبے پرت بنا دیتی تھی۔ اور پھر وہ پرت دوسری کل میں ڈال کر کترے جاتے تھے۔ اس طرح تم جیسی ہزاروں ہستیاں وجود میں آجاتی تھیں۔ زرد رنگ گندھک اور سرخ مصالحے کا لباس بھی کچھ عزت سے نہیں پہنایا جاتا تھا، بلکہ سرنگوں کر کے گرم گرم گندھک اور مصالحے میں تمھاری ناک ڈبو دی جاتی تھی۔ اس پر یہ مزاج کہ بیگم کہلانے کی آرزو! کچھی کی ڈبیا میں رہتے رہتے یہ دماغ ہو گیا! ابھی کوئی شخص بکس کی کالی مٹی سے منڈیا رگڑ کر پھینک دے گا۔ پھر جو آئے گا پاؤں میں مسلتا آئے گا۔

حضرت، آپ کو تو غصہ آ گیا۔ خفگی کی کیا بات ہے، جو چیز جہاں کی ہو اسی سے منسوب ہوتی ہے۔ میں مسلمانوں کی خانہ زاد ہوں، اگر رانی کے مقابلے میں بیگم

کو پسند کروں تو کیا گناہ ہے؟ یہ سب نام کی بحث ہے۔ کام دیکھنا چاہیے۔ سو جیسا مسلمانوں کا کام کرتی ہوں، بے کم وکاست ہندوؤں کا بھی بجالاتی ہوں۔ یہاں تک کہ میرے مشرب میں دیسی بدیسی، گورے کالے کا فرق بھی جائز نہیں۔ مندر میں میرے دم سے روشنی ہے اور مسجد میں بھی۔ راجہ اور نواب کے محل کی تاریکی دور کرتی ہوں، اور ایک غریب کے جھونپڑے میں بھی میرے سبب سے اجالا ہوتا ہے۔ میرے رانی اور بیگم کے لفظ سے آپ اتنے چونکے، ذرا اپنی ہٹ دھرمی تو دیکھیے کہ فقط نام اور لفظ کے فرق سے آپ کے کاموں میں بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ جو کالا کرتا ہے وہ گورا نہیں کرتا، جو مسلمان کو پسند ہے اس سے ہندو کو نفرت ہے۔ اور غریب اور کمزور ہونا تو گویا دائرۂ آدمیت سے خارج ہو جانا ہے۔ اس کو دنیا میں رہنے اور انسان کہلانے کا کوئی حق ہی باقی نہیں رہتا۔

بس بس۔ خاموش رہو بی فتنی۔ ہو تو اتنی سی مگر زبان بارہ ہاتھ کی ہے۔ لگیں حد سے گذرنے۔ تم کیا جانو کہ آدم زاد کی کیا عالی شان ہے۔ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئی ہو تو قرآن میں سنا ہوگا کہ خدا نے آدمی کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے اور تمام اسرار کا علم اس کو بخشا ہے۔ بس یہ جو کچھ کرتا ہے، عین منشائے الٰہی کے مطابق کرتا ہے، کیونکہ سب کاموں کی حقیقت اس کو معلوم ہے۔

اوہو، آپ کو یہ غرہ بھی ہے! بے شک آپ خلیفۂ خدا ہیں، مگر سب چیزوں کی حقیقت آپ کو معلوم نہیں۔ قرآن میں یہ تو آیا ہے کہ آدمی کو سب چیزوں کے نام بتا دیئے گئے تھے۔ یہ کہاں ہے کہ اصلیت بھی بتا دی گئی تھی؟ اگر اصلیت اور حقیقت معلوم ہے تو بتاؤ کہ بجلی کیا چیز ہے؟ وہ تو غلاموں کی طرح آپ کی خدمت کرتی ہے اور اس کی تابعداری پر آپ کو گھمنڈ بھی بہت بڑا ہے، مگر آج تک آپ کو یہ خبر نہیں کہ

یہ کیا چیز ہے اور چند حرکتوں سے کیوں کر ظاہر ہوتی ہے۔ خیر، بجلی تو بڑی چیز ہے، تنکے کے بھی اسرار سے آپ ناواقف ہیں کہ ذرا سی رگڑ سے یہ نورانی شعلہ کہاں سے آجاتا ہے۔ محض غلط ارشاد ہے کہ آپ کے سب کام عین مرضی الٰہی کے مطابق ہوتے ہیں۔ خدا کی ہوا عام ہے، پانی اور روشنی عام ہے، جنگل اور دریا عام ہیں، مگر آپ کی ذات شریف ان سب چیزوں کو اپنے لیے مخصوص کر لینا چاہتی ہے۔ آپ کی خواہش ہوتی ہے کہ روٹی پانی ہوا سب میرے قبضے میں ہوں۔ جس کو چاہوں دوں، جس کو چاہوں محروم کر دوں۔ ایک آدمی کروڑوں روپے خزانوں میں بند رکھتا ہے اور لاکھوں آدمی بھوک سے مر جاتے ہیں اور وہ خود غرض کچھ پروا نہیں کرتا۔ اپنی ہوس اور طمع کے جوش میں، نام اور نشان کے شوق میں لاکھوں ہم جنسوں کو فنا کر ڈالتا ہے۔ تو کیا خدائی خلافت کا دعویٰ انھیں اعمال سے کیا جاتا ہے، اور کیا یہ باتیں منشائے پروردگار کے موافق ہیں؟

خدا تمھاری طرار زبان کو چلا تا رکھے۔ میں ہارا تم جیتیں۔ ❀❀

غور کرنے کی بات

خواجہ حسن نظامی (1879 تا 1955) اردو کے بہت بڑے نثر نگار ہی نہیں، تاریخ نویس، صوفی، مذہبی رہنما، اخبار نویس، اور سماجی خدمت گذار بھی تھے۔ انھوں نے چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر بہت دلچسپ اور خوبصورت لیکن آسان زبان میں بہت سے مضامین لکھے جن میں ان ہی چھوٹی باتوں سے بہت بڑے بڑے مطلب انھوں نے نکالے اور پڑھنے والوں کے دل موہ لیے۔ ان کی زبان کبھی کبھی محمد حسین آزاد کی یاد دلاتی ہے لیکن چھوٹی باتوں سے نئے مطلب نکالنے اور انسانوں کو اچھی چیزوں کا سبق سکھانے کا خواجہ حسن نظامی کا اپنا انداز ہے جس میں کوئی ان کی برابری نہیں کر سکتا۔

دیاسلائی کی تیلی کہتی ہے کہ میں مسلمان گھر میں پیدا ہوئی، اس لیے مسلمان ہوں۔ اس میں خواجہ صاحب کا اشارہ یہ ہے کہ کسی کے گھر پیدا ہونے سے کچھ نہیں ہوتا، اصل چیز تو اپنے ذاتی اعمال اور عقیدے ہیں۔ اسی لیے آگے وہ ہمیں دکھاتے ہیں کہ دیاسلائی کی تیلی سے بات کرنے والا شخص اگرچہ انسان پیدا ہونے کے سبب خود کو خدا کا نائب سمجھتا ہے لیکن دراصل اس کے کام خدا کے نائب جیسے نہیں ہیں۔

یہ مضمون سو برس پرانا ہے، لیکن زبان کی تازگی اور صفائی ایسی ہے جیسے آج لکھا گیا ہو۔ دیاسلائی کے کارخانے میں دیاسلائی کیسے بناتے ہیں، اس بات کا بیان بھی اتنا عمدہ ہے گویا تصویر کھنچ رہی ہو۔ دلی کی پرانی زبان کی جھلک بھی کہیں کہیں ہے اور پرلطف ہے:

(1) ''آپ کا رنگ سانولا ہے مگر ہماری نگاہ میں سب دیاسلائیوں کی رانی ہو''۔ ''آپ'' کے ساتھ ''ہو'' کا استعمال دلی کی پرانی زبان میں عام تھا۔ پنجابی میں اب بھی ہے۔

(2) ''پرت'' لکھنؤ اور پوربی علاقوں میں مونث ہے، دلی میں مذکر ہے۔

(3) ''فتنہ'' بمعنی ''شرارت، فساد'' مذکر ہے۔ اس کا مونث ''فتنی'' بنا کر عورتوں کے لیے استعمال کرنا دلی کا محاورہ ہے۔

(4) ''مصالحہ'' بمعنی ''ایسی چیز جس کو کسی چیز پر لگایا جائے، یا کسی چیز میں ڈالا جائے'' کو بعض لوگ ''مسالہ/مسالا'' لکھنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن دلی والے ''مصالحہ'' ہی لکھتے ہیں۔

خواجہ صاحب کی زبان کی ایک اور خصوصیت بے تکلفی ہے۔ ''منڈیا'' بمعنی ''سر، کھوپڑی''، عام طور پر عورتوں کی زبان پر تھا، یا پھر بے تکلف اور مزاحیہ بول چال میں۔ دیاسلائی کے تنکے کے لحاظ سے ''منڈیا'' بہت مناسب ہے۔ اسی طرح، دیاسلائی کی تیلی کو ''تنکا'' یعنی گھاس یا لکڑی کی بہت معمولی ڈنڈی کہنا بہت مناسب اور پرلطف ہے۔ انسان اور دیاسلائی کی تیلی کے درمیان بات چیت کی خوبی یہ ہے کہ دونوں کے لہجے اور الفاظ اپنی اپنی جگہ بہت ٹھیک ہیں۔

''ظلمات'' بمعنی ''اندھیرا، اندھیری جگہ، اور وہ جگہ جہاں آب حیات کا چشمہ چھپا ہوا ہے''۔ اس کو اردو میں لام ساکن کے ساتھ پڑھتے ہیں، لیکن اسے لام پر پیش کے ساتھ ظُلُمات

بھی پڑھ سکتے ہیں۔ عربی کے بہت سے لفظ اردو میں اس طرح کے ہیں۔ مثلاً:

رمُضان/ رَمَضان؛ حَیوان/ حَیَوان؛ خَفقان/ خَفَقان

بہت سے لفظ ایسے ہیں کہ جب وہ واحد بولے جائیں تو ان کا دوسرا حرف متحرک ہوتا ہے، لیکن جب ان کی جمع بنتی ہے تو دوسرا حرف ساکن ہو جاتا ہے، مثلاً:

غَزَل/ غزْلیں، غزْلوں؛ نَظَر/ نظْریں، نظْروں؛ قَسَم/ قسْمیں، قسْموں

بہت سے چار حرفی عربی لفظ ایسے ہیں جن کا دوسرا حرف عربی میں متحرک ہے لیکن اردو میں زیادہ تر اسے ساکن بولتے ہیں، مثلاً:

جَذَبہ [اردو میں جذْبہ]؛ کَلِمہ [اردو میں کلْمہ]؛ صَدَقہ [اردو میں صدْقہ]؛ طَبَقہ [اردو میں طبْقہ]؛ دَرَجہ [اردو میں درْجہ]

فرہنگ

دن لگنا (کسی کو) =	To give oneself airs	(किसी का) घमण्ड करना, अकड़ना, (किसी को) हवा लगना।
کے آمدی کے پیر شدی =	Spoken to some inexperienced or young person when he/she behaves as if he/she is very senior and experienced. It's a Persian proverb whose literal sense is:"When did you come here and when did you become a senior?"	जब कोई कम उम्र का या कम अनुभवी व्यक्ति स्वंय को बड़ा या अनुभवी दिखाए तो उस अवसर पर ऐसा कहा जाता है। यह फ़ारसी कहावत है जिसका अर्थ है, "तुम कब आये और कब बुज़ुर्ग बन बैठे?"

گریبان میں منھ ڈالنا =	To look within oneself so as to know and be ashamed at one's faults.	अपने अन्दर झांकना (ताकि अपनी बुराइयां पता चलें और अपने ऊपर शर्म आए)
تراشیدہ =	(Generally for a piece of wood or stone) cut and hewed and shaped	काटा और छीला हुआ।
دار و گیر =	Taking and seizing, therefore tumult, conflict, tyranny	पकड़ना और रखना। अर्थात अत्याचार करना, किसी को परेशानी और मुसीबत में डालना।
پیچ و تاب =	Twisting and twining, restlessness, anxiety, distress	बेचैनी, उलझन, मोड़ना और ऐंठना।
دم دینا =	To impart temper to something by treating it with heat or steam	गर्मी या भाप के द्वारा किसी वस्तु में लचक पैदा करना, उसे नर्म बनाना।
مزاج =	Pride, vanity	प्रकृति। स्वभाव।
کھپچی =	A splinter	लकड़ी का छोटा सा पतला और चपटा टुकड़ा।
خانہ زاد =	A servant born in the master's house, hence anyone born in a person's house	ऐसा नौकर जो मालिक के घर में पैदा हुआ हो। अतः किसी के घर पैदा होने वाला कोई व्यक्ति।

مشرب =	Disposition, religion, way of behaving	मिज़ाज, तरीक़ा, धर्म
بارہ ہاتھ کی زبان والا =	A person who talks too much	बहुत अधिक बोलने वाला व्यक्ति।
خلیفہ =	A vicegerent, a deputy	नायब, वह व्यक्ति जो किसी शासक या बड़े अफ़सर के स्थान पर सर्वशक्ति और अधिकारों से काम करे।
اَسرار =	Plural of سر, meaning secret, mystery	'सिर्र' का बहुवचन। भेद या राज़।
غرّہ =	Pride, haughtiness	घमण्ड
ذات شریف =	A noble soul; this phrase is always spoken ironically, to mean just the opposite	नेक और उत्तम प्रकृति का व्यक्ति। इस वाक्यांश को व्यंग में इसके उलटे अर्थ में लेते हैं, अर्थात बुरा और शरारती व्यक्ति।
طرار =	Fluent, eloquent	बहुत तेज़, चालाक।

چندرو کی دنیا

کرشن چندر

کراچی میں بھی اس کا یہی دھندا تھا اور باندرے آکر بھی یہی دھندا رہا۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق تھا، کوئی تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ وہ کراچی میں بھی سدّھو حلوائی کے گھر کی سیڑھیوں کے پیچھے ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں سوتا تھا اور باندرے میں بھی وہیں سیڑھیوں کے عقب میں اسے جگہ ملی تھی۔ کراچی میں اس کے پاس ایک میلا کچیلا بستر، زنگ آلود پترے کا ایک چھوٹا سا سیاہ ٹرنک اور ایک پیتل کا لوٹا تھا۔ یہاں پر بھی وہی سامان تھا۔ ذہنی لگاؤ نہ اسے کراچی سے تھا نہ بمبئی سے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اسے معلوم ہی نہ تھا ذہنی لگاؤ کسے کہتے ہیں، کلچر کسے کہتے ہیں، حب الوطنی کیا ہوتی ہے اور کس بھاؤ سے بیچی جاتی ہے۔ وہ ان سب نئے دھندوں سے واقف نہ تھا۔ بس اسے اتنا یاد تھا کہ جب اس نے آنکھ کھولی تو اپنے کو سدّھو حلوائی کے گھر میں برتن مانجتے، جھاڑو دیتے، پانی ڈھوتے، فرش صاف کرتے اور گالیاں کھاتے پایا۔ اسے ان باتوں کا کبھی ملال نہ ہوا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ کام کرنے اور گالیاں کھانے کے بعد ہی روٹی ملتی ہے اور اس کی قسم والے لوگوں کو ایسے ہی ملتی ہے۔ علاوہ ازیں سدّھو حلوائی کے گھر میں اس کا جسم تیزی سے بڑھ رہا تھا اور اسے روٹی کی شدید ضرورت رہتی تھی اور ہر وقت محسوس ہوتی رہتی تھی۔ اس لیے وہ

حلوائی کے جھوٹے سالن کے ساتھ ساتھ اس کی گالی کو بھی روٹی کے ٹکڑے میں لپیٹ کے نگل جاتا تھا۔

اس کے ماں باپ کون تھے، کسی کو پتہ نہ تھا۔ خود چندرو نے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ البتہ سدھو حلوائی اسے گالیاں دیتا ہوا اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ چندرو کو سڑک پر سے اٹھا کر لایا ہے۔ اس پر چندرو نے کبھی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ نہ سدھو کے لیے شکریے کے نرم جذبے کا اس کے دل تک گذر ہوا۔ کیوں کہ چندرو کو کوئی دوسری زندگی یاد نہیں تھی۔

اسے بس اتنا معلوم تھا کہ کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے ماں باپ نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ گھر والے ہوتے ہیں، کچھ لوگ سیڑھیوں کے پیچھے سونے والے ہوتے ہیں، کچھ لوگ گالیاں دیتے ہیں، کچھ لوگ گالیاں سہتے ہیں۔ ایک کام کرتا ہے دوسرا کام کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ بس ایسی ہے یہ دنیا اور ایسی ہی رہے گی۔ دو خانوں میں بٹی ہوئی۔ یعنی ایک وہ جو اوپر والے ہیں، دوسرے وہ جو نیچے والے ہیں۔ ایسا کیوں ہے اور ایسا کیوں نہیں ہے اور جو ہے وہ کب کیوں اور کیسے بہتر ہوسکتا ہے؟ وہ یہ سب کچھ نہیں جانتا تھا۔ اور نہ اس قسم کی باتوں سے کوئی دلچسپی رکھتا تھا۔ البتہ جب کبھی وہ اپنے ذہن پر بہت زور دے کر سوچنے کی کوشش کرتا تھا تو اس کی سمجھ میں یہی آتا تھا کہ جس طرح وہ سٹے کے نمبر کا داؤ لگانے کے لیے کبھی کبھی ہوا میں سکہ اچھال کے ٹاس کر لیتا ہے۔ اسی طرح اس کے پیدا کرنے والے نے اس کے لیے ٹاس کر لیا ہوگا اور اسے اس خانے میں ڈال دیا ہوگا جو اس کی قسمت تھی۔

یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ چندرو کو اپنی قسمت سے کوئی شکایت تھی ہرگز نہیں! وہ

ایک خوش باش، محنت کرنے والا، بھاگ بھاگ کر جی لگا کر خوش مزاجی سے کام کرنے والالڑکا تھا۔ وہ رات دن اپنے کام میں اس قدر مشغول رہتا تھا کہ اسے بیمار پڑنے کی بھی کبھی فرصت نہیں ملی۔

کراچی میں تو وہ ایک چھوٹا سالڑکا تھا۔ مگر بمبئی آ کر تو اس کے ہات پاؤں اور کھلے اور بڑھے۔ سینہ پھیلا۔ گندمی رنگ صاف ہونے لگا۔ بالوں میں لچھے سے پڑنے لگے۔ آنکھیں زیادہ روشن اور بڑی معلوم ہونے لگیں۔ اس کی آنکھیں اور ہونٹ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ماں ضرور کسی بڑے گھر کی رہی ہوگی۔

چندرو کی دنیا میں آواز کا اس حد تک گذر تھا کہ وہ سن سکتا تھا۔ بول نہیں سکتا تھا۔ عام طور پر گونگے بہرے بھی ہوتے ہیں۔ مگر وہ صرف گونگا تھا بہرا نہ تھا۔ اس لیے حلوائی ایک دفعہ اسے بچپن میں ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ ڈاکٹر نے چندرو کا معائنہ کرنے کے بعد حلوائی سے کہا کہ چندرو کے حلق میں کوئی پیدائشی نقص ہے۔ مگر آپریشن کرنے سے یہ نقص دور ہوسکتا ہے اور چندرو کو بولنے کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ مگر حلوائی نے کبھی اس نقص کو آپریشن کے ذریعے دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سدھو نے سوچا یہ تو بہت اچھا ہے کہ نوکر گالی سن سکے مگر اس کا جواب نہ دے سکے۔

چندرو کا یہی نقص سدھو کی نگاہ میں اس کی سب سے بڑی خوبی بن گیا۔ اس دنیا میں مالکوں کی آدھی زندگی اسی فکر میں گذر جاتی ہے کہ کسی طرح وہ اپنے نوکروں کو گونگا کردیں۔ اس کے لیے قانون پاس کیے جاتے ہیں، پارلیمنٹیں سجائی جاتی ہیں، اخبار نکالے جاتے ہیں، پولیس اور فوج کے پہرے بٹھائے جاتے ہیں۔ سن لو مگر جواب نہ دو۔

اور چندرو تو پیدائشی گونگا تھا۔ یقیناً سدھو ایسا احمق نہیں ہے کہ اس کا آپریشن کروائے۔

سدھو بھی دل کا برا نہیں تھا۔ اپنے مخصوص حالات میں، مخصوص حدود کے اندر رہ کر اپنا مخصوص زاویۂ نگاہ رکھتے ہوئے وہ چندرو کو اپنے طریقے سے چاہتا بھی تھا۔ وہ سمجھتا تھا اور اس بات پر خوش تھا، اور اکثر اس کا فخریہ اظہار بھی کیا کرتا تھا کہ اس نے چندرو کی پرورش ایک بیٹے کی طرح کی ہے۔ کون کسی یتیم بچے کی اس طرح پرورش کرتا ہے۔ اس طرح پالتا پوستا بڑا کرتا ہے۔ کون اس طرح اسے کام پر لگاتا ہے۔ جب تک چندرو کا لڑکپن تھا، سدھو اس سے گھر کا کام لیتا رہا۔ جب چندرو لڑکپن کی حدود پھلانگنے لگا، سدھو نے اس کی خاطر ایک نیا دھندا شروع کیا۔

حلوائی کی دکان پر اس کے اپنے بیٹے بیٹھتے تھے۔ اس نے چندرو کے لیے چاٹ بیچنے کا دھندا طے کیا۔ ہولے ہولے اس نے چندرو کو چاٹ بنانے کا فن سکھا دیا۔ جل جیرہ اور کانجی بنانے کا فن۔ گول گپے اور دہی بڑے بنانے کے طریقے۔ چٹخارہ پیدا کرنے والے تیکھے مصالحے۔ کرکری پاپڑیاں اور چنے کا لذیذ مرچیلا سالن۔ بھٹورے بنانے اور تلنے کے انداز۔ پھر سموسے اور آلو کی ٹکیاں بھرنے کا کام۔ پھر چٹنیاں۔ لہسن کی چٹنی۔ لال مرچ کی چٹنی۔ ہرے پودینے کی چٹنی۔ کھٹی چٹنی۔ میٹھی چٹنی۔ ادرک کی چٹنی اور پیاز اور انار دانے کی چٹنی۔

پھر انواع و اقسام کی چاٹیں پروسنے کے انداز۔ دہی بڑے کی چاٹ۔ کانجی کے بڑے کی چاٹ۔ میٹھی چٹنی کے پکوڑوں کی چاٹ۔ آلو کی چاٹ۔ آلو اور آلو پاپڑی کی چاٹ۔ ہری مونگ کے گول گپے۔ آلو کے گول گپے۔ کانجی کے گول گپے۔ ہرے مصالحے کے گول گپے۔

جتنے برسوں میں چندرو نے یہ کام سیکھا اتنے برسوں میں ایک لڑکا ایم۔ اے۔ پاس کر لیتا ہے پھر بھی بے کار رہتا ہے۔ مگر سدھو کا گھر بے کار گریجو یٹوں کو اگلنے کی یونیورسٹی نہیں تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ چندرو اپنے کام میں مشاق ہو گیا ہے اور جوان ہو گیا ہے تو اس نے چار پہیوں والی ایک ہاتھ گاڑی خریدی۔ چاٹ کے تھال سجائے اور چندرو کو چاٹ بیچنے پر لگا دیا، ڈیڑھ روپیہ روز پر۔

جہاں چندرو چاٹ بیچنے لگا وہاں اس کا کوئی مدمقابل نہ تھا۔ سدھو نے بہت سوچ سمجھ کے یہ جگہ انتخاب کی تھی۔ کھارلنکنگ روڈ پر اور پالی ہل کے چوراہے کے قریب ٹیلیفون ایکسچینج کے سامنے اس نے چاٹ کی پہیوں والی سائیکل گاڑی کو کھڑا کیا۔ یہ جگہ بہت بارونق تھی۔ ایک طرف یونین بینک تھا، دوسری طرف ٹیلیفون ایکسچینج۔ تیسری طرف ایرانی کی دکان، چوتھی طرف گھوڑ بندر روڈ کا ناکہ۔ بیچ میں شام کے وقت کھاتے پیتے خوش باش خوش لباس نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ہجوم بہتا تھا۔ چندرو کی چاٹ ہمیشہ تازہ عمدہ اور کراری ہوتی تھی۔

وہ بول نہیں سکتا تھا مگر اس کی مسکراہٹ بڑی دلکش ہوتی تھی۔ اس کا سودا ہمیشہ کھرا ہوتا تھا۔ بات صاف اور تول پورا۔ گاہک کو اور کیا چاہیے؟ چندرو کی چاٹ اس نوآبادی میں چاروں طرف مقبول ہوتی گئی۔ اور شام کے وقت اس کے ٹھیلے کے چاروں طرف نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ہجوم رہنے لگا۔ چندرو کو سدھو نے ڈیڑھ روپیہ روز پر لگایا تھا۔ اب اسے تین روپے روز دیتا تھا۔ اور چندرو جو ڈیڑھ روپے روز میں خوش تھا، اب تین روپیہ پا کر بھی خوش تھا کیوں کہ خوش رہنا اس کی عادت تھی۔ اسے کام کرنا پسند تھا اور وہ اپنا کام جانتا تھا۔ اور اپنے کام سے اسے لگن تھی۔ وہ اپنے

گاہکوں کوخوش کرنا جانتا تھا۔ اور انھیں خوش کرنے میں اپنی خوشی محسوس کرتا تھا۔ دن بھر وہ چاٹ تیار کرنے میں مصروف رہتا۔ شام کے چار بجے وہ چاٹ گاڑی لے کر ناکے پر جاتا۔ چار سے آٹھ بجے تک ہاتھ روکے بغیر، آرام کا سانس لیے بغیر، وہ جلدی جلدی کام کرتا۔ آٹھ بجے اس کا ٹھیلا خالی ہوجاتا اور وہ اسے لے کر اپنے مالک کے گھر واپس آجاتا۔ کھانا کھا کے سنیما چلا جاتا۔ بارہ بجے رات کو سنیما سے لوٹ کر اپنی چٹائی بچھا کر سیڑھیوں کے پیچھے سوجاتا۔ اور صبح پھر اپنے کام پر۔

یہ اس کی زندگی تھی۔ یہ اس کی دنیا تھی۔ وہ بے فکر اور زندہ دل تھا۔ نہ ماں نہ باپ نہ بھائی نہ بہن۔ نہ بچے نہ بیوی۔ دوسرے لوگوں کے بہت سے خانے ہوتے ہیں۔ اس کا صرف ایک ہی خانہ تھا۔ دوسرے لوگ بہت سے ٹکڑوں میں بٹے ہوتے ہیں اور ان ٹکڑوں کو جوڑ کر ہی ان کی شخصیت دیکھی جاسکتی ہے مگر چندرو ایک ہی لکڑی کا تھا۔ اور لکڑی کے ایک ہی ٹکڑے سے بنا تھا۔ جیسا وہ اندر سے تھا ویسا ہی وہ باہر سے بھی نظر آتا تھا۔ وہ اپنی ذات میں بے جوڑ اور مکمل تھا۔

سانولی پارو کو اسے پریشان کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ کانوں میں چاندی کے بالے جھلاتی، پاؤں میں چھوٹی سی پازیب کھنکاتی جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس کے ٹھیلے کے گرد کھڑی ہوجاتی تو چندرو سمجھ جاتا کہ اب اس کی شامت آئی ہے۔ دہی بڑے کی پتّل تقریباً چاٹ کر وہ ذرا سا دہی بڑا اس پر لگا رہنے دیتی اور پھر اسے دکھا کر کہتی۔

''ابے گونگے، تو بہرا بھی ہے کیا؟ میں نے دہی بڑے نہیں مانگے تھے دہی پٹا کری مانگی تھی۔ اب اس کے پیسے کون دے گا۔ تیرا باپ؟''

اتنا کہہ کر وہ اس بڑے کی تقریباً خالی پتّل کو اسے دکھا کر بڑی حقارت سے زمین پر پھینک دیتی۔

وہ جلدی جلدی اس کے لیے دہی پٹا کری بنانے لگتا۔ پارو اس پٹا کری کی پتّل صاف کر کے اس میں آدھی پٹا کری چھوڑ دیتی اور غصے سے کہتی۔

''اتنی مرچ ڈال دی؟ اتنی مرچی؟ چاٹ بنانا نہیں آتا ہے تو ٹھیلہ لے کر ادھر کیوں آتا ہے؟ لے اپنی پٹا کری واپس لے لے۔''

اتنا کہہ کر وہ دہی اور چٹنی کی پٹا کری اپنے ناخن کی کور میں پھنسا کر اس کے ٹھیلے پر گھماتی۔ کبھی اسے جھوٹی پٹا کریوں کے تھال میں واپس ڈال دینے کی دھمکی دیتی۔ اس کی سہیلیاں ہنستیں۔ تالیاں بجاتیں۔ چندرو دونوں ہاتھوں سے ناں ناں کے اشارے کرتا ہوا پارو سے اپنی جھوٹی پٹا کری زمین پر پھینک دینے کا اشارہ کرتا۔

''اچھا سمجھ گئی، تیرے چنوں کے تھال میں ڈال دوں؟'' وہ جان بوجھ کر اس کا اشارہ غلط سمجھتی۔ جلدی جلدی گھبرائے ہوئے انداز میں چندرو زور زور سے سر ہلاتا پھر زمین کی طرف اشارہ کرتا۔ پارو کھلکھلا کر کہتی۔

''اچھا زمین سے مٹی اٹھا کر تیرے دہی کے برتن میں ڈال دوں؟'' پارو نیچے زمین سے تھوڑی سی مٹی اٹھا لیتی۔

اس پر چندرو اور بھی گھبرا جاتا۔ دونوں ہاتھ زور سے ہلا کر منع کرتا۔

بالآخر پارو اسے دھمکاتی۔ ''تو چل جلدی سے آلو کی چھ ٹکیاں تل دے۔ اور خوب گرم گرم مصالحے والے چنے دینا۔ اور ادرک بھی، نہیں تو یہ پٹا کری ابھی جائے گی تیرے کالے گلاب جامنوں کے برتن میں...''

چندرو خوش ہو کر پوری بتیسی نکال دیتا۔ ماتھے پر آئی ہوئی ایک گھنگریالی لٹ

پیچھے کو ہٹا کے تو لیے سے ہاتھ پونچھ کے جلدی سے پارو اور اس کی سہیلیوں کے لیے آلو کی ٹکیاں تلنے میں مصروف ہو جاتا۔

پھر کبھی کبھی پارو حساب میں بھی گھپلا کیا کرتی۔

''ساٹھ پیسے کی ٹکیاں۔تیس پیسے کی پٹا کری۔دہی بڑے تو میں نے مانگے ہی نہیں تھے۔اس کے پیسے کیوں ملیں گے تجھے...؟ ہو گئے نوے پیسے دس پیسے کل کے باقی ہیں...لے ایک روپیہ۔''

گونگا چندر و پیسے لینے سے انکار کرتا۔ وہ کبھی پارو کی شوخ چمکتی ہوئی شریر آنکھوں کو دیکھتا۔کبھی اس کی لمبی لمبی انگلیوں میں کپکپاتے ایک روپئے کے نوٹ کو دیکھتا اور سر ہلا کر انکار کر دیتا اور حساب سمجھانے بیٹھتا۔ وہ وقت قیامت کا ہوتا تھا جب وہ پارو کو حساب سمجھاتا تھا۔دہی بڑے کے تھال کی طرف اشارہ کر کے اپنی انگلی کو اپنے منہ پر رکھ کر چپ چپ کی آواز پیدا کرتے ہوئے گویا اس سے کہتا۔

''دہی بڑے کھا تو گئی ہو۔اس کے پیسے کیوں نہیں دو گی...''

''تیس پیسے دہی بڑے کے بھی لاؤ۔'' وہ اپنے گلے میں سے تیس پیسے نکال کے پارو کو دکھاتا۔اس پر فوراً چمک کر کہتی۔

''اچھا تیس پیسے مجھے واپس دے رہے ہو؟ لاؤ...''

اس پر چندر و فوراً اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیتا۔''نہیں...''

انکار میں وہ سر ہلا کے پارو کو سمجھاتا۔

''مجھے نہیں تمھیں دینا ہوں گے یہ تیس پیسے۔'' وہ اپنی تہدیدی انگلی پارو کی طرف بڑھا کے اشارہ کر کے کہتا۔اس پر پارو فوراً اسے ٹوک دیتی۔

''اے اپنا ہاتھ پیچھے رکھ...نہیں تو ماروں گی چپل۔''

اس پر چندرو گھبرا جاتا۔ پارو کی ڈانٹ سے لا جواب ہو کر بالکل بے بس ہو کر مجبور اور خاموش نگاہوں سے پارو کی طرف دیکھنے لگتا کہ پارو کو اس پر رحم آ جاتا۔ جیب سے پورے پیسے نکال کے اسے دے دیتی اور بولتی...

''تو بہت گھپلا کرتا ہے حساب میں۔کل سے تیرے ٹھیلے پر نہیں آؤں گی۔''

مگر دوسرے دن وہ پھر آ جاتی۔ اسے چندرو کو چھیڑنے میں مزہ آتا تھا۔ اور اب چندرو کو بھی مزہ آنے لگا تھا۔ جس دن وہ نہیں آتی تھی۔ حالانکہ اس دن بھی اس کی گاہکی اور کمائی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر جانے کیا بات تھی چندرو کو وہ دن سونا سونا سا لگتا تھا۔

جہاں پر اس کا ٹھیلا رکھا تھا، وہ اس کے سامنے ایک گلی سے آتی تھی۔ پہلے پہل چندرو کا ٹھیلہ بالکل یونین بینک کے سامنے ناکے پر تھا۔ ہولے ہولے چندرو اپنے ٹھیلے کو کھسکاتے کھسکاتے پارو کی گلی کے بالکل سامنے لے آیا۔ اب وہ دور سے پارو کو اپنے گھر سے نکلتے دیکھ سکتا تھا۔ پہلے دن جب اس نے ٹھیلہ یہاں لگایا تھا تو پارو ٹھیلے کی بدلی ہوئی جگہ دیکھ کر کچھ چونکی تھی۔ کچھ غصے سے بھڑک گئی تھی۔

''ارے تو ناکے سے ادھر کیوں آ گیا گونگے؟''

گونگے چندرو نے ٹیلی فون ایکس چینج کی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں وہ اب تک ٹھیلا لگاتا آ رہا تھا۔ ادھر کیبل بچھانے کے لیے زمین کھودی جا رہی تھی اور بہت سے کالے کالے پائپ رکھے ہوئے تھے۔

وجہ معقول تھی پارو لاجواب ہو گئی۔ پھر کچھ نہیں بولی۔ لیکن جب کیبل بچھ گئے اور زمین کی مٹی ہموار کر دی گئی تو بھی چندرو نے اپنا ٹھیلا نہیں ہٹایا۔ تو بھی وہ کچھ نہیں بولی۔ ہاں اس کے چنچل سبھاؤ میں ایک عجیب تیزی سی آ گئی۔ وہ اسے پہلے سے زیادہ

ستانے لگی۔

پارو کی دیکھا دیکھی اس کی دوسری سہیلیاں بھی چندرو کو ستانے لگیں اور کئی چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی۔ مگر لڑکوں کو تو چندرو ڈانٹ دیتا اور وہ جلدی سے بھاگ جاتے۔ ایک بار اس نے پارو کی سہیلیوں سے عاجز آ کر انھیں بھی ڈانٹ بتائی۔ تو اس پر پارو اس قدر ناراض ہوئی کہ اس نے اگلے تین چار دنوں تک چندرو کو ستانا بند کر دیا اس پر چندرو کو ایسا لگا کہ آسمان اس پر ڈھے پڑا ہو۔ یا اس کے پیروں تلے زمین پھٹ گئی ہو۔ یہ پارو مجھے ستاتی کیوں نہیں ہے؟ طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے اس نے چاہا کہ پارو اسے ڈانٹ پلائے۔ لیکن جب اس پر بھی پارو کے انداز نہیں بدلے اور وہ ایک مہذب، متمدن، لیکن چاٹ بیچنے والے چندرو ایسے چھوکروں کو فاصلے پر رکھنے والی لڑکی کی طرح، اس سے چاٹ کھاتی رہی تو چندرو اپنی گونگی حماقتوں پر بہت نادم ہوا۔

ایک دفعہ اس نے بجائے پارو کے خود سے حساب میں گھپلا کر دیا۔ سوا روپیہ بنتا تھا اس نے پارو سے پونے دو روپے طلب کیے، جان بوجھ کر۔ خوب لڑائی ہوئی۔ جم کے لڑائی ہوئی۔ بالآخر سر جھکا کر چندرو نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور یہ گویا ایک طرح پچھلی تمام غلطیوں کی بھی تلافی تھی۔

چندرو بہت خوش ہوا کیوں کہ پارو اور اس کی سہیلیاں اب پھر اسے ستانے لگی تھیں۔

بس اسے اتنا کچھ ہی چاہیے۔ ایک پازیب کی کھنک اور ایک شریر ہنسی جو پھلجھڑی کی طرح اس کی گونگی سنسان دنیا کے ویرانے کو ایک لمحے کے لیے روشن کر دے۔ پھر جب پارو کے قدم سہیلیوں کے قدموں میں گڈ مڈ ہو کے چلے جاتے،

وہ اس پازیب کی کھنک کو دوسری پازیبوں کی کھنک سے الگ کر کے سنتا تھا۔ کیوں کہ دوسری لڑکیاں بھی چاندی کی پازیبیں پہنتی تھیں۔ مگر پارو کی پازیب کی موسیقی ہی کچھ اور تھی۔ یہ موسیقی جو اس کے کانوں میں نہیں اس کے دل کے کسی تنہا تاریک اور شرمیلے گوشے میں سنائی دیتی تھی۔ بس اتنا ہی کافی تھا اور وہ اسی میں خوش تھا۔

اچانک مصیبت نازل ہوئی ایک دوسرے ٹھیلے کی صورت میں۔ کیا ٹھیلہ تھا یہ! بالکل نیا اور جدید ڈیزائن کا۔ چاروں طرف چمکتا ہوا کانچ لگا تھا اوپر نیچے دائیں بائیں چاروں طرف لال پیلے، اودے اور نیلے رنگ کے کانچ تھے۔ گیس کے دو ہنڈے تھے۔ جن سے یہ ٹھیلہ بقعۂ نور بن گیا تھا۔ پتّل کی جگہ چمکتی ہوئی چینی کی پلیٹیں تھیں۔ ٹھیلے والے کے ساتھ ایک چھوٹا سا چھوکرا بھی تھا جو گاہک کو بڑی مستعدی سے ایک پلیٹ اور ایک صاف ستھری نیپکن بھی پیش کرتا تھا اور پانی بھی پلاتا تھا۔ چاٹ والے کے گھڑے کے گرد موگرے کے پھولوں کا ہار بھی لپٹا ہوا تھا۔ اور ایک چھوٹا ہار چاٹ والے نے اپنے کلائی پر بھی باندھ رکھا تھا۔ اور جب وہ مصالح دار پانی میں گول گپے ڈبو کر پلیٹ میں رکھ کر گاہک کے ہاتھوں کی طرف سرکاتا تو چاٹ کی کراری خوشبو کے ساتھ گاہک کے نتھنوں میں موگرے کی مہک بھی شامل ہو جاتی۔ اور گاہک مسکرا کر نئے چاٹ والے سے گویا کسی تمغے کی طرح اس پلیٹ کو حاصل کر لیتا۔

اور نیا چاٹ والا گونگے چاٹ والے کی طرف تحقیر سے دیکھ کر پُرنخوت آواز میں زور سے کہتا۔

''چکھیے!''

ایک ایک دو دو کر کے چندرو کے بہت سے گاہک ٹوٹ کر نئے ٹھیلے والے کے گرد جمع ہونے لگے تو بھی چندرو کو زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ پھر آ جائیں گے، یہ اونچی دکان پھیکے پکوان والے کب تک چندرو کی سچی اصلی اور صحیح مصالحوں رچی ہوئی چاٹ کا مقابلہ کریں گے؟ ہم بھی دیکھ لیں گے۔ اس نے دو ایک گاہکوں کو نئے چاٹ والے کی طرف جاتے ہوئے کنکھیوں سے دیکھ بھی لیا تھا۔ اور اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ چکنی چمکتی پلیٹوں اور ہوٹل نما سروس کے باوجود انھیں نئے چاٹ والے کی چاٹ زیادہ پسند نہیں آ رہی ہے۔

وہ پہلے سے بھی زیادہ مستعد ہو کر اپنے کام میں جٹ گیا۔ یکا یک اس کے کانوں میں پازیب کی ایک کھنک سنائی دی، اس کا دل زور زور سے دھڑک گیا۔ اس نے نگاہ اٹھا کے دیکھا۔

گلی سے پارو پازیب کھنکاتی اپنی سہیلیوں کے سنگ برآمد ہو رہی تھی، جیسے چڑیاں چہکیں، ایسے وہ لڑکیاں بول رہی تھیں۔ کتنی ہی بڑی بڑی اور شوخ نگاہیں تھیں۔ فضا میں ابابیلوں کی طرح تیرتی ہوئیں وہ سڑک پار کر کے اس کے ٹھیلے کی طرف بڑھنے لگیں۔

اچانک پارو کی نگاہیں نئے ٹھیلے والے کی طرف اٹھیں۔

وہ رک گئی۔

اس کی سہیلیاں بھی رک گئیں۔

وہ سانس لیے بغیر پارو کی طرف دیکھنے لگا۔

پارو نے ایک اچٹتی سی نگاہ چندرو کے ٹھیلے پر ڈالی۔ پھر نخوت سے اس نے

منھ پھیر لیا۔ اور اک ادائے خاص سے مڑ کر اپنی سہیلیوں کو لے کر نئے ٹھیلے والے کے پاس پہنچ گئی۔

''تم بھی؟ تم بھی؟ پارو تم بھی؟''

چندرو کا چہرہ غصے اور شرم سے لال ہو گیا۔ رگوں اور نسوں میں خون گونجنے لگا۔ جیسے اس کا حلق خون سے بھر گیا ہو۔ وہ کچھ بول نہیں سکا۔ مگر اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ بولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ اس موٹی دیوار کو توڑ دے گا جو اس کی روح کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ ابھی چیخ کر کہے گا... ''تم بھی!... ؟ تم بھی؟ پارو... تم بھی!!'' مگر خون اس کے حلق میں بھر گیا تھا۔ اس کے کان کسی بڑھتے ہوئے طوفان کی آوازیں سن رہے تھے اور اس کا سارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا گویا کوئی آخری کوشش کسی لوہے کی دیوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی تھی۔ اور وہ سر جھکا کر اپنے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مگر اس بے چین پازیب کی کھنک ابھی تک اس کے دل میں تھی۔ پارو اور اس کی سہیلیاں نئے ٹھیلے والے کے گرد جمع انواع و اقسام کی چاٹیں کھائے چلی جا رہی تھیں اور بیچ بیچ میں تعریفیں کرتی جا رہی تھیں۔ ان سب میں پارو کی آواز سب سے اونچی تھی۔

''ہائے کیسی لذیذ چاٹ ہے۔ کیسے برابر کے مصالحے ہیں۔ اس موئے (نام نہ لے کر محض اشارہ کر کے) پرانے ٹھیلے والے کو تو چاٹ بنانے کی تمیز ہی نہیں ہے۔''

''اب تک جھوٹی پتلوں میں چاٹ کھلاتا رہا ہے۔''

''اری اس کے ہات تو دیکھو...'' پارو نے چمک کر چندرو کی طرف اشارہ کیا۔

''کیسے گندے اور غلیظ... معلوم ہوتا ہے سات دن سے نہایا نہیں...''

''ایک نیپکن تو نہیں اس کے پاس۔ جب ہاتھ پونچھنے کے لیے مانگو وہی اپنا گندا میلا تولیہ آگے کر دیتا ہے۔''

''اونھ ...'' پارو کے پتلے پتلے ہونٹ نفرت سے خم ہو گئے۔ میں تو کبھی اس چاٹ والے کے ٹھیلے پر تھوکوں بھی نا۔''

اس کے آگے چندرو کچھ سن نہ سکا۔ ایک لال آندھی اس کی آنکھوں میں چھا گئی۔ وہ گونگوں کی سی ایک وحشت زدہ چیخ کے ساتھ اپنا ٹھیلہ چھوڑ کر آگے بڑھا اور اس نے نئے ٹھیلے والے کو جا لیا۔ اور اس سے گتھم گتھا ہو گیا۔ لڑکیاں چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئیں۔

چندرو نئے ٹھیلے والے اور اس کے چھوکرے دونوں پر بھاری ثابت ہوا۔ چندرو ایک وحشی جانور کی طرح لڑ رہا تھا۔ اس نے نئے ٹھیلے والے کو مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔ اس کے ٹھیلے کے سارے کانچ توڑ ڈالے۔ چھوکرے کی پٹائی کی۔ نیا ٹھیلہ مع اپنے ساز و سامان کے سڑک پر اوندھا دیا۔ پھر سڑک کے بیچ کھڑا ہو کر زور زور سے ہانپنے لگا۔

پولیس آئی اور اسے گرفتار کر کے لے گئی۔

عدالت میں اس نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔ عدالت نے اسے دو ماہ قید کی سزا دی۔ اور پان سو روپیہ جرمانہ۔ اور جرمانہ نہ دینے پر چار ماہ قید بامشقت۔

سدھو حلوائی نے جرمانہ نہیں بھرا۔

اور دوسرا کون تھا جو جرمانہ ادا کرتا؟

چندرو نے پورے چھ ماہ کی جیل کاٹی۔

جیل کاٹ کر چندرو پھر سدھو حلوائی کے گھر پہنچ گیا۔ کوئی دوسرا اس کا ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔ سدھو حلوائی پہلے تو اسے دیر تک گالیاں دیتا رہا اور اس کی حماقت پر اسے بے نقط سناتا رہا اور دیر تک چندرو سر جھکائے خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ اگر وہ گونگا بھی نہ ہوتا تو کس سے کہتا۔ اس کا جرم یہ نہیں تھا کہ اس نے ایک ٹھیلے والے کو مارا تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک پازیب کی کھنک سنی تھی۔

جب سدھو حلوائی نے خوب اچھی طرح گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لی تو اس نے اسے پھر کام پر لگا لیا۔ آخر کیا کرتا؟ چندرو بے حد ایماندار محنتی اور اپنے کام میں مشاق تھا۔ اب جیل کاٹ کے آیا ہے تو تھوڑی سی عقل بھی آگئی ہوگی کہ قانون کو اپنے ہات میں لینے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس نے خوب اچھی طرح سمجھا بجھا کے دو تین دن کے بعد پھر سے چندرو کو اسی اڈے پر ٹھیلہ دے کر روانہ کر دیا۔

چندرو کی غیر حاضری میں سدھو نے ایک اچھا کام کیا تھا۔ اس نے چندرو کے ٹھیلے پر نیا رنگ روغن کرا دیا تھا۔ کانچ بھی لگا دیا تھا۔ پتلوں کی جگہ کچھ سستی قسم کی چینی کی پلیٹیں اور کچھ چمچے بھی رکھ دیے تھے۔

چندرو چھ ماہ بعد پھر سے ٹھیلہ لے کر روانہ ہوا۔ آٹھویں، دسویں اور گیارہویں سڑک پار کر کے لنکنگ روڈ کے ناکے پر آیا۔ یونین بنک سے گھوم کر ٹیلی فون ایکسچینج کے پاس پہنچا۔ اس نے دیکھا جہاں پر پہلے اس کا ٹھیلہ تھا اب اس جگہ اس نئے ٹھیلے والے نے قبضہ کر لیا تھا۔ وہی چھوکرا ہے، وہی ٹھیلے والا ہے۔ اس ٹھیلے والے نے گھور کر چندرو کو دیکھا۔ چندرو نے اپنی نظریں چرا لیں۔ اس نے نئے ٹھیلے والے سے کچھ فاصلے پر ایکسچینج کے ایک طرف اپنا ٹھیلہ روک دیا۔ اور گاہکوں کا انتظار

کرنے لگا۔

چار بج گئے، پانچ بج گئے، چھ بج گئے۔کوئی گاہک اس کے پاس نہیں بھٹکا۔ دو ایک گاہک آئے مگر وہ نئے تھے اور اسے جانتے نہیں تھے۔ چار چھ آنے کی چاٹ کھا کر چل دیے۔ افسردہ دل چندر و سر جھکائے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کبھی تولیہ لے کر کانچ چمکاتا۔ ڈوئی ڈال کر گھڑے میں مصالحے دار پانی کو ہلاتا۔ انگیٹھی میں آنچ ٹھیک کرتا۔ ہولے ہولے آلو کے بھرتے میں مٹر کے دانے اور مصالحے ڈال کر ٹکیاں بناتا رہا۔

... پھر یکایک اس کے کانوں میں پازیب کی کھنک سنائی دی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خون رخساروں کی طرف دوڑنے لگا۔ وہ اپنے جھکے ہوئے سر کو اوپر اٹھانا چاہتا تھا۔ مگر اس کا سر اوپر نہیں اٹھتا تھا... پازیب کی کھنک اب سڑک پر آ گئی تھی۔

پھر جسم و جان کا زور لگا کر اس نے اپنی گری ہوئی گردن کو اوپر اٹھایا۔ اور جب دیکھا تو اس کی آنکھیں پارو پر جمی کی جمی رہ گئیں۔ اس کے ہاتھ سے ڈوئی گر گئی۔ اور تولیہ اس کے کاندھے سے اتر کر نیچے بالٹی میں بھیگ گیا اور ایک گاہک نے قریب آ کر کہا۔

''مجھے دو سمو سے دو۔''

مگر اس نے کچھ نہیں سنا۔ اس کے بدن میں جتنے حواس تھے جتنے احساس تھے جتنے جذبات تھے سب کھنچ کر اس کی آنکھوں میں آ گئے تھے۔ اب اس کے پاس کوئی جسم نہ تھا۔ صرف آنکھیں ہی آنکھیں تھیں۔

یہ اس کا ٹھیلہ تھا۔ وہ چند قدم پر دوسرا ٹھیلہ تھا۔ اور وہ تکے جا رہا تھا۔ پارو کدھر جائے گی؟

ہولے ہولے سرگوشیوں میں بات کرتے ہوئے گاہے گاہے اس کی طرف دیکھتے ہوئے لڑکیاں سڑک پر چلتے ہوئے ان دونوں ٹھیلوں کے قریب آرہی تھیں۔ زیرلب بحث دھیرے دھیرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

یکا یک جیسے اس بحث کا خاتمہ ہوگیا۔لڑکیوں نے سڑک پار کرکے نئے ٹھیلے والے کے ٹھیلے کو گھیر لیا۔

مگر چندرو کی نگاہیں نئے ٹھیلے والے کی طرف نہیں پھریں۔ وہ اس خلا میں دیکھ رہا تھا،گلی اور سڑک کے سنگم پر، جہاں آج چھ ماہ کے بعد اس نے پارو کو دیکھا تھا۔ وہ سر اٹھائے دنیاومافیہا،گردوپیش سے بےخبر ادھر ہی دیکھتا رہا۔

وہ پتھر کی طرح کھڑا صرف خلا میں دیکھ رہا تھا۔

یکا یک بڑی تیزی سے اکیلی پارو اپنی سہیلیوں سے کٹ کر اس کے ٹھیلے پر آگئی اور چپ چاپ اس کے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑی ہوگئی۔

اسی لمحہ گونگا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ آنسو نہیں تھے۔الفاظ تھے...شکرانے کے۔دفتر تھے شکایتوں کے...ابلتے ہوئے آنسو... فصیح اور بلیغ جملوں کی طرح اس کے گالوں پر بہتے آرہے تھے۔ اور پارو سر جھکائے سن رہی تھی۔

آج پارو گونگی تھی اور چندرو بول رہا تھا۔ارے وہ کیسے کہے اس پگلے سے کہ پارو نے بھی تو چھ ماہ انھیں آنسوؤں کا انتظار کیا تھا۔

❀❀

غور کرنے کی بات

کرشن چندر(1912 تا1977) اپنے زمانے کے مقبول ترین اردو افسانہ نگار اور طنز و مزاح نگار تھے۔اب وہ پہلے کے اتنے مشہور نہیں ہیں لیکن اپنے زمانے میں انھیں ''ایشیا کا عظیم

افسانہ نگار'' کہا جاتا تھا۔ اپنے زمانے کے اکثر بڑے لکھنے والوں کی طرح کرشن چندر بھی ترقی پسند خیالات سے متاثر تھے۔ ان کی تحریروں میں غریب، پچھڑے ہوئے اور مظلوم طبقوں کے لوگوں کا ذکر بہت ہمدردی سے، اور امیر لوگوں، مزدوروں کے مالکوں، یا پچھڑے ہوئے طبقوں کے ساتھ زیادتی کرنے والے کرداروں وغیرہ کا ذکر ذرا بے رحمی سے کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے مظلوم یا پچھڑے ہوئے طبقوں کے کردار اپنی جگہ پر خود بھی زندگی اور داخلی وجود رکھتے ہیں، صرف ''نمونہ'' نہیں بنتے۔ کرشن چندر کی دوسری بڑی خوبی ان کی نثر ہے جو نہایت سادہ، رواں، شگفتہ، اور دل میں بیٹھ جانے والی نثر ہے۔ اس کے باعث ان کے ہلکے پھلکے افسانے بھی یاد رہ جاتے ہیں۔ تیسری بات یہ کہ وہ افسانے کو دھیرے دھیرے اس طرح آگے بڑھاتے ہیں کہ واقعات کی تہیں آپ سے آپ کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ زیر نظر افسانے میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں۔

زبان کو بے تکلفی سے استعمال کرنے کی وجہ سے کرشن چندر ہلکے پھلکے انگریزی لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً Toss ''ٹاس''، Cable ''کیبل''، ''سروس'' Service وغیرہ۔ یہ الفاظ لوگوں کی زبانوں پر جاری ہیں لہٰذا برے نہیں معلوم ہوتے۔

کرشن چندر نے ''مصالح/مصالحے'' لکھا ہے۔ اس لفظ پر بہت بحث ہوتی رہی ہے اور بعض لوگ چاہتے ہیں کہ اسے ''مسالہ/مسالا/مسالے'' لکھا جائے۔ لیکن ''مصالح'' کھانے کو مزیدار بنانے والی چیز یا چیزوں'' کے معنی درست فارسی میں ہے اور وہاں سے اردو میں آیا۔ لہٰذا ''مصالحہ/مصالحے'' لکھنے میں کوئی ہرج نہیں۔ بولنے میں بہر حال ''مسالہ/مسالے'' ہو جاتا ہے۔ ''گندا'' دراصل ''گندہ'' ہے لیکن بول چال میں ''گندا'' بول دیتے ہیں۔ ''روپیہ'' کی جمع بعض لوگ ''روپیے'' لکھتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے ''روپے'' لکھتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے ''رُپے'' لکھتے ہیں۔ یہ سب غیر ضروری ہے۔ ''روپیہ'' کی جمع جو عام طور پر رائج ہے وہ ''روپئے'' ہے، باقی سب غلط ہیں۔

کرشن چندر نے 'پانچ'' کی جگہ ''پان'' لکھا ہے۔ یہ فارسی میں بھی ہے اور اردو میں بھی پہلے بہت عام تھا۔ اب کم سننے میں آتا ہے۔ اسی طرح، انھوں نے جگہ جگہ ''ہات'' بمعنی ''ہاتھ''

لکھا ہے۔ یہ بھی پرانے زمانے کا املا ہے۔ اب بھی کہیں کہیں دیکھنے میں آجاتا ہے۔ ''شیشہ'' کی جگہ ''کانچ'' بھی اب کم بولا جاتا ہے۔ ہاں ''کانچ کی چوڑیاں'' اب بھی بولتے ہیں۔ وہاں ''شیشے کی چوڑیاں'' نہیں بولتے۔ اسی طرح، کرشن چندر نے ''آنکھ'' کے معنی میں ''نگاہ'' لکھا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے، جیسے ''سینہ'' کے ایک معنی ''دل'' بھی ہیں۔ ''ٹھکانا''، ''ٹھیلا'' جیسے الفاظ پہلے الف کے بجائے چھوٹی ہ سے لکھے جاتے تھے۔ ان کو الف سے لکھنا بہتر ہے۔

کرشن چندر کو عام چیزوں سے کس قدر دلچسپی ہے اور ان چیزوں کے بارے میں ان کی معلومات کتنی اچھی ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے چاٹ اور اس کی قسموں اور چٹنیوں کی اتنی لمبی فہرست دی ہے کہ منھ میں پانی آجاتا ہے۔ ان کی جزئیات نگاری سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ چاٹ بیچنے والے چندرو کی روزانہ زندگی اور مشغلے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ اگرچہ کرشن چندر نے مالک (سدھو حلوائی) اور نوکر (چندرو) کی زندگی کو ذرا سرسری بیان کیا ہے، لیکن اس بیان کے اندر بہت کچھ سچائی اور تھوڑی سی گہرائی بھی ہے۔ چندرو کو زندگی سے کچھ زیادہ نہ چاہیے۔ لیکن جو کچھ وہ چاہتا ہے (پارو کی توجہ اور چندرو کے غریبانہ دھندے میں اس کی دلچسپی) وہ بالکل فطری ہے اور اس کی کہانی ہمارے دل پر اثر کرتی ہے۔

فرہنگ

پترا	= Tin	टिन
سجانا	= To set everything in its proper place	हर चीज़ को अपनी जगह पर ठीक से रखना।

کانجی=	Water saturated with small mustard seeds and used for eating with a hollow savoury or drinking like a digestive	राई या सरसों भिगो कर गोल गप्पों के लिए तैयार किया गया पानी। इसे हाज़्मे के लिए भी पीते हैं।
پٹاکری=	A short, crisp savoury, eaten with chutney or curds	पापड़ी, पपड़ी।
ناکہ=	The point where a lane or street originates	वह जगह जहां से कोई सड़क या गली शुरू होती है।
تہدید=	To threaten; Threat	डराना, धमकाना, धमकी।
بقعۂ نور=	A place glittering with light; also called "نور کا بکا"	रोशनी से जगमगाती हुई जगह। इसे 'नूर का बुक्का' भी बोलते हैं।
رچی ہوئی=	Fully saturated with spices	जिसमें मसालों का असर अच्छी तरह से फैल गया हो।
دنیاومافیہا=	The world and whatever is in it	संसार, और जो कुछ भी इसमें है।

بادل

انتظار حسین

وہ بادلوں کی تلاش میں دور تک گیا۔ گلی گلی گھومتا ہوا کچی کوئیا پہنچا۔ وہاں سے کچے راستے پر پڑلیا اور کھیت کھیت چلتا چلا گیا۔ مخالف سمت سے ایک گھسیارا گھاس کی گٹھڑی سر پر رکھے چلا آرہا تھا۔ اسے اس نے روکا اور پوچھا کہ ''ادھر بادل آئے تھے؟''

''بادل؟'' گھسیارے نے اس تعجب سے کہا جیسے اس سے بہت انوکھا سوال کیا گیا ہو۔

''ہاں بادل۔'' اور جب گھسیارے کی حیرت میں کوئی کمی نہ آئی تو وہ اس سے مایوس ہوا اور آگے چل کر اس نے کھیت میں ایک ہل چلاتے ہوئے کسان سے یہی سوال کیا۔ ''ادھر بادل آئے تھے؟''

کسان کی سمجھ میں بھی یہ سوال نہ آیا۔ اس نے سٹپٹا کر کہا۔ ''بادل؟''

''ہاں بادل۔''

اصل میں وہ بادلوں کے متعلق ایسے پوچھ رہا تھا جیسے ڈھونڈنے والا راہ چلتے ہوؤں سے گم ہو جانے والے بچے کے متعلق پوچھتا ہے۔ شاید بادل بھی گمشدہ بچے تھے کہ وہ انھیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا اور ہر راہ چلتے سے پوچھ رہا تھا مگر کسی نے اسے تشفی

بخش جواب نہیں دیا۔

سب سے پہلے آج صبح اس نے اماں جی سے یہ سوال کیا تھا۔'' اماں جی بادل کہاں گئے؟''

''کون کہاں گئے؟'' اماں جی نے اس سے ایسے پوچھا جیسے اس نے بہت احمقانہ سوال کیا تھا۔

''بادل۔''

''بادل ...ارے تیرا دماغ چل گیا ہے۔جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو، ناشتہ کر اوراسکول جا۔''

اماں جی کے اس انداز بیان نے اس پر ایک ناخوشگوار اثر چھوڑا۔اس نے بے دلی سے منہ ہاتھ دھویا، ناشتہ کیا اور کتابوں کا بیگ گلے میں ڈال اسکول کے لیے گھر سے نکلا۔مگر گھر سے نکلتے ہی اس کے ذہن میں پھر وہی سوال ابھرا، بادل کہاں گئے؟ اور اس کے ساتھ اسے رات کا وہ وقت یاد آیا جب اس نے بادل امنڈتے گرجتے دیکھے تھے۔ جب وہ سونے لگا تھا اس وقت آسمان بادلوں سے خالی اور ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہوا بند تھی اور گرمی سے نیند نہیں آرہی تھی۔اسے مشکل سے نیند آئی۔پھر جانے کیا وقت تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔جو وقت بھی ہو اس کے لیے وہ آدھی رات تھی۔دور آسمان پر بادل ایک گرج کے ساتھ امنڈ رہے تھے۔بیچ بیچ میں بجلی چمکتی اور اس چمک میں وہ بادل بہت کالے کالے نظر آتے۔اسے لگا کہ بہت زور کی بارش آئے گی۔مگر اس میں نیند کتنی خراب ہوتی۔بس اسی اندیشے سے اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ایسے ہو گیا۔جیسے اسے خبر ہی نہیں ہے کہ بادل گرج رہے ہیں۔ سو گیا۔صبح جب اٹھا تو حیران رہ گیا۔آسمان ...آسمان بادلوں سے بالکل خالی تھا اور

صحن میں بوندیں پڑنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اسے پہلے تعجب ہوا۔ پھر افسوس ہوا۔ تعجب اس بات پر کہ بادل اتنے امنڈ گھمنڈ آئے تھے اور برسے نہیں۔ پھر گئے کہاں۔ افسوس اس پر کہ وہ سو کیوں گیا۔ جیسے وہ جاگتا رہتا تو بادل آنکھوں سے اوجھل نہ ہو پاتے اور پھر برس کر ہی جاتے۔ وہ بارش ہو جاتی تو موسم کی پہلی بارش ہوتی۔ مگر اس کے سوتے ہوئے بادل گھر کر آئے اور چلے گئے۔ بارش کی کوئی بوند نہیں پڑی۔ برسات کا موسم خالی گذرا جا رہا تھا اس نے چلتے چلتے پھر ایک بار آسمان کا جائزہ لیا۔ دور تک کوئی بادل نہیں تھا۔ خالی آسمان میں سورج عین اس کے سر پر چمک رہا تھا۔ وہ اسکول کا راستہ چھوڑ کر کھیتوں میں نکل گیا۔

کھیتوں کے بیچ پتلی پتلی بٹیوں پر ہوتا ہوا وہ دور نکل گیا۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ اس کا بدن پھنکنے لگا، حلق خشک ہو گیا۔ کئی کھیت پار کرنے کے بعد گھنی چھاؤں والا ایک پیڑ دکھائی دیا کہ اس کی چھاؤں میں کنواں چل رہا تھا۔ گویا ریگستان میں چلتے چلتے نخلستان آ گیا۔ اس نے درخت کی چھاؤں میں پہنچ کر کتابوں کا بیگ ایک طرف رکھا۔ کنوئیں کے پاس پہنچ کر رہٹ سے نکلتے ہوئے پانی سے پیر دھوئے، ہاتھ منہ دھویا اور پھر جی بھر کر پانی پیا۔

منہ ہاتھ دھو کر پانی پی کر آنکھوں میں ٹھنڈک اور روشنی آئی۔ اب اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ کنوئیں کے پاس ہی ٹوٹے سے مونڈھے پر ایک بڑے میاں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اس نے کئی مرتبہ بڑے میاں کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا مگر پھر ہمت چھوڑ بیٹھا۔ آخر اس نے ہمت باندھی اور بولا۔ ''بڑے میاں! ادھر بادل آئے تھے؟''

بڑے میاں نے حقہ پیتے پیتے اسے غور سے دیکھا۔ پھر بولے۔ ''بیٹا، بادل

چھپ کر تو نہیں آئیں گے۔ جب گھر کر آئیں گے تو آسمان زمین کو پتہ چل جائے گا۔"

"مگر رات تو بادل آئے تھے اور کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔"

"رات بادل آئے تھے؟" بڑے میاں نے کچھ سوچا۔ پھر اونچی آواز سے اللہ دین سے مخاطب ہوئے۔"اللہ دین رات بادل آئے تھے؟"

اللہ دین بیلوں کو ہانکتے ہانکتے رکا۔ بولا"میں تو جی رات کھاٹ پر پیٹھ لگاتے ہی سو گیا تھا۔ مجھے پتہ نہیں۔"

پھر بڑے میاں بولے۔"بیٹا! بادلوں کے خالی آنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں ایسے علاقے میں رہ چکا ہوں جہاں دس سال سے بارش نہیں ہوئی تھی۔"

"دس سال سے؟" اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں دس سال سے، مگر بادل آتے تھے۔ میں جن دنوں وہاں تھا ان دنوں بھی ایک دفعہ بادل بہت گھر کے آئے تھے۔ مگر پانی کی ایک بوند نہیں پڑی۔"

"عجیب بات ہے۔"

"عجیب بات کوئی نہیں۔ بارش اس کے حکم سے ہوتی ہے اس کا حکم ہوتا ہے تو بادل برستے ہیں اس کا حکم نہیں ہوتا تو بادل نہیں برستے۔"

بڑے میاں کے اس بیان کے ساتھ ساتھ اس کے تصور میں پچھلی مختلف گھٹائیں امنڈ آئیں۔ وہ گھٹائیں جو گھٹا ٹوپ اندھیرے کے ساتھ اٹھیں جیسے برس کر جل تھل کر دیں گی۔ مگر بوند برسائے بغیر گذر گئیں۔ وہ گھٹائیں جو چند بے معنی سی بدلیوں کی صورت میں آئیں اور ایسی برسیں کہ تال تلیاں امنڈ آئیں۔

بڑے میاں نے تپتے آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر بڑبڑائے۔"موسم گذرا

جار ہا ہے۔ پتہ نہیں اس کا حکم کب ہوگا۔"

جواب میں وہ بھی بڑبڑایا۔ "مینہ برستا ہی نہیں۔ پتہ نہیں بادل آ کے کہاں چلے گئے۔"

"بیٹا کیا برسے، برسے گا تو خبریں آنے لگیں گی کہ سیلاب آ گیا۔ آسمان بخیل ہو گیا۔ زمین میں ظرف نہیں رہا۔ بارش ہوئی ہی نہیں۔ ہوتی ہے، تو سیلاب امنڈ پڑتا ہے۔"

بڑے میاں کی باتیں اس کی سمجھ میں کچھ آئیں کچھ نہ آئیں۔ وہ بیٹھا سنتا رہا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ بہت دیر ہو گئی ہے۔ کتابوں کا بیگ اٹھا، گلے میں ڈال اٹھ کھڑا ہوا۔

مٹی دھول اور دھوپ میں وہ دیر تک چلتا رہا۔ جن راستوں سے آیا تھا انھیں راستوں پر لوٹ رہا تھا۔ دھوپ اب بھی تیز تھی۔ مگر جب وہ کچی کوئیا کے پاس پہنچا تو اسے لگا کہ ہوا میں ایک ٹھنڈی لکیر سی تیر گئی ہے اور قدموں کے نیچے مٹی کچھ سیلی سیلی ہے۔

بستی میں داخل ہوتے ہوئے اس نے دیکھا کہ رستہ یہاں سے وہاں تک گیلا ہے، درخت کہ اس کے جاتے وقت روز کی طرح دھول میں اٹے کھڑے تھے اب نہائے دھوئے نظر آ رہے ہیں اور نالا کہ پچھلی برسات کے بعد سے خشک چلا آ رہا تھا، رواں ہو گیا ہے۔ خوشی کی ایک لہر اس کے اندر دوڑ گئی۔ اب اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے صحن میں جو جامن کا پیڑ کھڑا ہے وہ کتنا تر و تازہ ہوا ہے۔

گھر پہنچ کر اس نے فضا کو بارش کے حساب سے بدلا ہوا پایا۔ جامن سے

بہت سے پتے نیچے گرے پڑے تھے اور گیلی مٹی میں لت پت تھے۔ باقی درخت نہایا دھویا کھڑا تھا اور اماں جی ایک آسودگی کے لہجے میں کہہ رہی تھیں "اچھی بارش ہوگئی۔ اللہ تیرا شکر ہے۔ میرا تو گرمی سے دم الٹنے لگا تھا۔"

جامن کی ٹہنیوں سے بوندیں ابھی تک ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ وہ پیڑ کے نیچے کھڑا ہو گیا اور بوندوں کو اپنے سر پر اور اپنے گالوں پر لیا۔ اس کی نظر آسمان پر گئی۔ آسمان دھلا دھلا نظر آرہا تھا۔ اب وہاں کوئی بدلی نہیں تھی۔ اسے خیال آیا کہ وہ بادلوں کی تلاش میں دھوپ اور دھول میں کتنی دور تک گیا اور بادل اس کے پیچھے آئے اور برس کر چلے بھی گئے۔ اس خیال نے اسے اداس کر دیا۔ بارش میں بھیگی ساری فضا اسے بے معنی نظر آنے لگی۔ ❀❀

غور کرنے کی بات

انتظار حسین (پیدائش 1925) کو عام طور پر آج کا سب سے بڑا اردو افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔ انھوں نے ناول اور ڈرامے بھی لکھے ہیں، تنقید اور انگریزی اردو میں اخباری کالم بھی لکھے ہیں اور ہر میدان میں خود کو ممتاز کیا ہے۔ لیکن افسانے کے میدان میں اس وقت ان کا ثانی کوئی نہیں نظر آتا۔ انتظار حسین نے 1947 میں وطن (ڈبائی، ضلع بلند شہر) اور میرٹھ (جہاں انھوں نے تعلیم پائی) چھوڑ کر پاکستان کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور ان کی بہت سی تحریروں میں وطن سے ہجرت اور چھوڑی ہوئی چیزوں کا غم نظر آتا ہے۔ لیکن انھوں نے ہندو دیو مالا اور اسلامی روایات سے بھی بہت کام لیا ہے اور اپنے افسانوں اور ناولوں کی دنیا کو وسیع کیا ہے۔ ان کے بہت سے افسانوں میں (اور ہمارا افسانہ "بادل" بھی انھیں میں سے ایک ہے) ایسی چیزوں یا باتوں کا ذکر آتا ہے جن کا انتظار کیا جا رہا ہے لیکن وہ آتی نہیں ہیں، یا اگر آتی ہیں بھی تو انتظار کرنے والوں کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ اس طرح افسانہ "بادل" اس انسانی صورت حال کو پیش کرتا ہے جس میں اچھی چیزوں کی امید، یا بھلائی کی تمنا کبھی صحیح معنوں میں پوری نہیں ہوتی۔ انتظار حسین کی زبان بہت

ہی سادہ لیکن خوبصورت اور رواں ہے۔ یہ ہمیں دھوکا دیتی ہے کہ ایسی زبان لکھنا بہت آسان ہے۔لیکن درحقیقت ایسی زبان لکھنا بہت ہی مشکل ہے جس میں بظاہر کوئی گہرائی نہ ہو لیکن جس میں ہر بات پوری طرح کہہ دی گئی ہو۔محمد حسین آزاد کی نثر بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

انتظار حسین کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ زبان بھی اسی کردار کی لکھتے ہیں جس کردار کی طرف سے افسانہ بیان ہوتا ہے۔ یہاں افسانہ ایک دیہاتی لڑکے کی طرف سے بیان ہوا ہے۔ لہٰذا انتظار حسین نے چھوٹے کوئیں کے معنی میں '' کوئیاں'' نہ لکھ کر '' کوئیا'' لکھا ہے جو مغربی یوپی کی مقامی زبان ہے۔

'' تال تلیاں'' بھی عام پڑھے لکھے شہری لوگوں کی زبان پر نہیں ہے۔ '' بادل اتنے امنڈ گھمنڈ آئے تھے''، یہ فقرہ بھی گھریلو انداز کا ہے۔ انتظار حسین ایسی ہی سادہ لیکن تازہ زبان لکھتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کا افسانہ یادر کھنے کی چیز بن جاتا ہے۔

'' میرے سوتے ہوئے'' بمعنی '' جب میں سو رہا تھا'' بھی دلچسپ فقرہ ہے۔ اردو میں اس طرح کے استعمال عام ہیں: '' میرے ہوتے ہوئے''، '' میرے دیکھتے ہوئے''؛ وغیرہ۔ ایسے فقرے صرف اردو میں ہیں اور کسی زبان میں نہیں۔

'' گٹھری'' عام طور پر پورب میں بولتے ہیں، انتظار حسین نے '' گٹھڑی'' لکھا ہے جو دہلی اور مشرقی علاقوں میں رائج ہے۔

'' امنڈنا'' اور '' اُمڈنا'' دونوں ٹھیک ہیں۔ '' اُمڈا'' البتہ '' امنڈا'' سے بہتر ہے۔ '' امنڈ/ امنڈنا/امنڈا'' ان سب کو یوں بولتے ہیں کہ ن پورا نہیں سنائی دیتا بلکہ نون غنہ سنائی دیتا ہے۔

فرہنگ

بٹیا =	A very narrow pathway similar formed in a field place due to people walking there regularly	बहुत संकरी पगडंडी जो खेत या मैदान में लोगों के गुज़रने से बन जाती है।

کوئیا=	A small and generally narrowwell	छोटा और ज़रा संकरा कुंआ।
امنڈ گھمنڈ=	Very dense (cloud)	बहुत घने रूप में (बादल)
نخلستان=	Oasis	मरूद्यान / रेगिस्तान का ऐसा क्षेत्र जहां पानी और हरियाली हो।
بخیل=	Miserly	कंजूस, कृपण।
ظرف=	Capacity	किसी चीज़ को स्वीकार करने और उसे लेकर रखने की क्षमता।
کنواں چلنا=	To draw water from a big leather bucket or bag for irrigation	डोल या रहट के द्वारा कुंए से पानी निकालना।
(کسی راستے پر) پڑلینا=	to step on to (a road or path)	कोई रास्ता अपनाना।
میرے سوتے ہوئے=	While I slept	जब मैं सो रहा था।

بھولا

راجندر سنگھ بیدی

میں نے مایا کو پتھر کے ایک کوزے میں مکھن رکھتے دیکھا۔ چھاچھ کی کھٹاس کو دور کرنے کے لیے مایا نے کوزے میں پڑے ہوئے مکھن کو کنوئیں کے صاف پانی سے کئی بار دھویا۔ اس طرح مکھن کے جمع کرنے کی کوئی خاص وجہ تھی۔ ایسی بات عموماً مایا کے کسی عزیز کی آمد کا پتہ دیتی تھی۔ ہاں! اب مجھے یاد آیا۔ دو دن کے بعد مایا کا بھائی اپنی بیوہ بہن سے راکھی بندھوانے کے لیے آنے والا تھا۔ یوں تو اکثر بہنیں بھائیوں کے ہاں جا کر انھیں راکھی باندھتی ہیں مگر مایا کا بھائی اپنی بہن اور بھانجے سے ملنے کے لیے خود ہی آجایا کرتا تھا اور راکھی بندھوالیا کرتا تھا۔ راکھی بندھوا کر وہ اپنی بیوہ بہن کو یہی یقین دلاتا تھا کہ اگرچہ اس کا سہاگ لٹ گیا ہے مگر جب تک اس کا بھائی زندہ ہے، اس کی رکھشا، اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لیتا ہے۔

ننھے بھولے نے میرے اس خیال کی تصدیق کر دی۔ گنا چوستے ہوئے اس نے کہا:

''بابا! پرسوں ماموں جی آئیں گے نہ...؟''

میں نے اپنے پوتے کو پیار سے گود میں اٹھالیا۔ بھولے کا جسم بہت نرم و

نازک تھا اور اس کی آواز بہت سریلی تھی۔ جیسے کنول کی پتیوں کی نزاکت اور سفیدی گلاب کی سرخی اور بلبل کی خوش الحانی کو اکٹھا کر لیا گیا ہو۔ اگرچہ بھولا میری لمبی اور گھنی داڑھی سے گھبرا کر مجھے اپنا منہ چومنے کی اجازت نہ دیتا تھا، تاہم میں نے زبردستی اس کے سرخ گالوں پر پیار کی مہر ثبت کر دی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا:

''بھولے، تیرے ماموں جی... تیری ماتا جی کے کیا ہوتے ہیں؟''

بھولے نے کچھ تامل کے بعد جواب دیا۔ ''ماموں جی!''

مایا نے استوتر پڑھنا چھوڑ دیا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ میں اپنی بہو کے اس طرح کھل کر ہنسنے پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ مایا بیوہ تھی اور سماج اسے اچھے کپڑے پہننے اور خوشی کی بات میں حصہ لینے سے بھی روکتا تھا۔ میں نے بارہا مایا کو اچھے کپڑے پہنے، ہنسنے، کھیلنے کی تلقین کرتے ہوئے سماج کی پروا نہ کرنے کے لیے کہا تھا مگر مایا نے ازخود اپنے آپ کو سماج کے روح فرسا احکام کے تابع کر لیا تھا۔ اس نے اپنے تمام اچھے کپڑے اور زیورات کی پٹاری ایک صندوق میں مقفل کر کے چابی ایک جوہڑ میں پھینک دی تھی۔

مایا نے ہنستے ہوئے اپنا پاٹھ جاری رکھا:

ہری ہر، ہری ہر، ہری ہر، ہری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

پھر اس نے اپنے لال کو پیار سے بلاتے ہوئے کہا:

''بھولے، تم منّی کے کیا ہوتے ہو؟''

''بھائی!'' بھولے نے جواب دیا۔

''اسی طرح تیرے ماموں جی میرے بھائی ہیں۔''

بھولا یہ بات نہ سمجھ سکا کہ ایک ہی شخص کس طرح ایک ہی وقت میں کسی کا بھائی کسی کا ماموں ہوسکتا ہے۔ وہ تو اب تک یہی سمجھتا آیا تھا کہ اس کے ماموں جان اس کے بابا جی کے بھی ماموں جی ہیں۔ بھولے نے اس مخمصے میں پڑنے کی کوشش نہ کی اور اچک کر ماں کی گود میں جا بیٹھا۔ اور اپنی ماں سے گیتا سننے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ وہ گیتا محض اس وجہ سے سنتا تھا کہ وہ کہانیوں کا شوقین تھا اور گیتا کے ادھیائے کے آخر میں مہاتم سن کر وہ بہت خوش ہوتا۔ اور پھر جوہڑ کے کنارے اگی ہوئی دوب کی مخملی تلواروں میں بیٹھ کر گھنٹوں ان مہاتموں پر غور کیا کرتا۔

مجھے دوپہر کو اپنے گھر سے چھ میل دور اپنے مزارعوں کو ہل پہنچانے تھے۔ بوڑھا جسم، اس پر مصیبتوں کا مارا ہوا، جوانی کے عالم میں تین تین من بوجھ اٹھا کر دوڑا کیا۔ مگر اب بیس سیر بوجھ کے نیچے گردن چٹخنے لگتی ہے۔ بیٹے کی موت نے امید کو یاس میں تبدیل کر کے کمر توڑ دی تھی۔ اب میں بھولے کے سہارے ہی جیتا تھا ورنہ دراصل تو مر چکا تھا۔

رات کو میں تکان کی وجہ سے بستر پر لیٹتے ہی اونگھنے لگا۔ ذرا توقف کے بعد مایا نے مجھے دودھ پینے کے لیے آواز دی۔ میں اپنی بہو کی سعادت مندی پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا اور اسے سیکڑوں دعائیں دیتے ہوئے میں نے کہا:

''مجھ بوڑھے کی اتنی پروا نہ کیا کرو بیٹا۔''

بھولا ابھی تک نہ سویا تھا۔ اس نے ایک چھلانگ لگائی اور میرے پیٹ پر چڑھ گیا۔

بولا:

''بابا جی! آپ آج کہانی نہیں سنائیں گے کیا؟''

''نہیں بیٹا۔'' میں نے آسمان پر نکلے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہوئے کہا:

''میں آج بہت تھک گیا ہوں۔کل دوپہر کو تمھیں سناؤں گا۔''

بھولے نے روٹھتے ہوئے جواب دیا۔''میں تمھارا بھولا نہیں بابا۔ میں ماتا جی کا بھولا ہوں۔''

بھولا بھی جانتا تھا کہ میں نے اس کی ایسی بات کبھی برداشت نہیں کی۔ میں ہمیشہ اس سے یہی سننے کا عادی تھا کہ'' بھولا بابا جی کا ہےاور ماتا جی کا نہیں۔'' مگر اس دن ہلوں کو کندھے پر اٹھا کر چھ میل تک لے جانے اور پیدل ہی واپس آنے کی وجہ سے میں بہت تھک گیا تھا۔شاید میں اتنا نہ تھکتا اگر میرا نیا جوتا ایڑی کو نہ دباتا اور اس وجہ سے میرے پاؤں میں ٹیسیں نہ اٹھتیں۔اس غیر معمولی تھکن کے باعث میں نے بھولے کی وہ بات بھی برداشت کی۔ میں آسمان پر ستاروں کو دیکھنے لگا۔آسمان کے جنوبی گوشے میں ایک ستارہ مشعل کی طرح روشن تھا۔غور سے دیکھنے پر وہ مدھم سا ہونے لگا...میں اونگھتے سو گیا۔

صبح ہوتے ہی میرے دل میں خیال آیا کہ بھولا سوچتا ہوگا کہ کل رات بابا نے میری بات کس طرح برداشت کی؟ میں اس خیال سے لرز گیا کہ بھولے کے دل میں کہیں یہ خیال نہ آیا ہو کہ اب بابا میری پرواہ نہیں کرتے۔شاید یہی وجہ تھی کہ صبح کے وقت اس نے میری گود میں آنے سے انکار کر دیا اور بولا:

''میں نہیں آؤں گا تیرے پاس بابا!''

''کیوں بھولے؟''

''بھولا بابا جی کا نہیں۔بھولا ماتا جی کا ہے۔''

میں نے بھولے کو مٹھائی کے لالچ میں منالیا اور چند ہی لحات میں بھولا بابا جی

کا بن گیا اور میری گود میں آ گیا اور اپنی ننھی ٹانگوں کے گرد میرے جسم سے لپٹے ہوئے کمبل کو لپیٹنے لگا۔ مایا ہری ہر استوتر پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے پاؤ بھر مکھن نکالا اور اسے کوزے میں ڈال کر کنوئیں کے صاف پانی سے چھاچھ کی کھٹاس کو دھو ڈالا۔ اب مایا نے اپنے بھائی کے لیے سیر کے قریب مکھن تیار کر لیا۔ میں بہن بھائی کے اس پیار کے جذبے پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اتنا خوش کہ میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے دل میں کہا: عورت کا دل محبت کا ایک سمندر ہوتا ہے۔ ماں باپ بہن بھائی خاوند بچے سب سے وہ بہت ہی پیار کرتی ہے اور اتنا کرنے پر بھی وہ ختم نہیں ہوتا۔ ایک دل کے ہوتے ہوئے بھی وہ سب کو اپنا دل دیے دیتی ہے۔

بھولے نے دونوں ہاتھ میرے گالوں کی جھریوں پر رکھے۔ مایا کی طرف سے چہرے کو ہٹا کر اپنی طرف کر لیا اور بولا:

''بابا تمھیں اپنا وعدہ یاد ہے نہ؟''

''کس بات کا، بیٹا؟''

''تمھیں آج دوپہر کو مجھے کہانی سنانی ہے۔''

''ہاں بیٹا!'' میں نے اس کا منھ چومتے ہوئے کہا۔

یہ تو بھولا ہی جانتا ہوگا کہ اس نے دوپہر کے آنے کا کتنا انتظار کیا۔ بھولے کو اس بات کا علم تھا کہ بابا جی کے کہانی سنانے کا وقت وہی ہوتا ہے جب وہ کھانا کھا کر اس پلنگ پر جا لیٹتے ہیں جس پر وہ بابا جی یا ماتا جی کی مدد کے بغیر نہیں چڑھ سکتا تھا۔ چنانچہ وقت سے آدھ گھنٹہ پیشتر ہی اس نے کھانا نکلوانے پر اصرار شروع کر دیا۔ میرے کھانے کے لیے نہیں بلکہ اپنی کہانی سننے کے چاؤ سے۔

میں نے معمول سے آدھ گھنٹہ پہلے کھانا کھایا۔ ابھی آخری نوالہ میں نے توڑا

ہی تھا کہ پٹواری نے دروازے پر دستک دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہلکی سی جریب تھی۔ اس نے کہا کہ خانقاہ والے کنوئیں پر آپ کی زمین کو ناپنے کے لیے مجھے آج ہی فرصت مل سکتی ہے۔ پھر نہیں۔

دالان کی طرف نظر دوڑائی تو میں نے دیکھا، بھولا چارپائی کے چاروں طرف گھوم کر بستر بچھا رہا تھا۔ بستر بچھانے کے بعد اس نے ایک بڑا سا تکیہ بھی ایک طرف رکھ دیا اور خود پائینتی میں پاؤں اڑا کر چارپائی پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اگرچہ بھولے کا مجھے اصرار سے جلد روٹی کھلانا اور بستر بچھا کر میری تواضع کرنا اپنی خود غرضی پر مبنی تھا تاہم میرے خیال میں آیا، ''آخر مایا ہی کا بیٹا ہے نہ... ایشور اس کی عمر دراز کرے۔''

میں نے پٹواری سے کہا۔ ''تم خانقاہ والے کنوئیں کو چلو اور میں تمھارے پیچھے پیچھے آجاؤں گا۔ جب بھولے نے دیکھا کہ میں باہر جانے کے لیے تیار ہوں تو اس کا چہرہ اس طرح مدھم پڑ گیا جیسے گذشتہ شب کو آسمان کے ایک کونے میں مشعل کی مانند روشن ستارہ مسلسل دیکھتے رہنے کی وجہ سے ماند پڑ گیا تھا۔ مایا نے کہا:

''بابا جی، اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ خانقاہ والا کنواں کہیں بھاگا تو نہیں جاتا... آپ کم سے کم آرام تو کر لیں۔''

''اوہوں۔'' میں نے زیر لب کہا۔ ''پٹواری چلا گیا تو پھر یہ کام ایک ماہ سے ادھر نہ ہو سکے گا۔''

مایا خاموش ہو گئی۔ بھولا منہ بسورنے لگا۔ اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اس نے کہا: ''بابا میری کہانی، میری کہانی۔''

''بھولے، میرے بچے۔'' میں نے بھولے کو ٹالتے ہوئے کہا۔ ''دن کو کہانی

سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔''

''راستہ بھول جاتے ہیں؟'' بھولے نے سوچتے ہوئے کہا۔'' بابا تم جھوٹ بولتے ہو ... میں بابا جی کا بھولا نہیں بنتا۔''

اب جب کہ میں تھکا ہوا بھی نہیں تھا اور پندرہ بیس منٹ آرام کے لیے نکال سکتا تھا، بھلا بھولے کی اس بات کو آسانی سے کس طرح برداشت کر لیتا۔ میں نے اپنے شانے سے چادر اتار کر چارپائی کی پائینتی پر رکھی اور اپنی دبتی ہوئی ایڑی کو جوتی کی قید بامشقت سے نجات دلاتے ہوئے پلنگ پر لیٹ گیا۔ بھولا پھر اپنے بابا کا بن گیا۔ لیٹتے ہوئے میں نے بھولے سے کہا:

''اب کوئی مسافر راستہ کھو بیٹھے...تو اس کے تم ذمے دار ہو۔''

اور میں نے بھولے کو دوپہر کے وقت سات شہزادوں اور سات شہزادیوں کی ایک لمبی کہانی سنائی۔ کہانی میں ان کی باہمی شادی کو میں نے معمول سے زیادہ دلکش انداز میں بیان کیا۔ بھولا ہمیشہ اس کہانی کو پسند کرتا تھا جس کے آخر میں شہزادے اور شہزادی کی شادی ہو جائے۔ مگر میں نے اس روز بھولے کے منھ پر خوشی کی کوئی علامت نہ دیکھی بلکہ وہ ایک افسردہ سا منھ بنائے خفیف طور پر کانپتا رہا۔

اس خیال سے کہ پٹواری خانقاہ والے کنوئیں پر انتظار کرتے کرتے تھک کر اپنی ہلکی ہلکی جھنکار پیدا کرنے والی جریب جیب میں ڈال کر کہیں اپنے گاؤں کا رخ نہ کر لے، میں جلدی جلدی مگر اپنے نئے جوتے میں دبتی ہوئی ایڑی کی وجہ سے لنگڑاتا ہوا بھاگا۔ گو مایا نے جوتی کو سرسوں کا تیل لگا دیا تھا۔ تاہم وہ نرم مطلق نہ ہوئی تھی۔

شام کو جب میں واپس آیا تو میں نے بھولے کو خوشی سے دالان سے صحن میں اور صحن سے دالان میں کودتے پھاندتے دیکھا۔ وہ لکڑی کے ایک ڈنڈے کو گھوڑا بنا کر اسے بھگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

''چل ماموں جی کے دیس...رے گھوڑے، ماموں جی کے دیس

ماموں جی کے دیس، ہاں ہاں! ماموں جی کے دیس۔ گھوڑے...''

جوں ہی میں نے دہلیز میں قدم رکھا۔ بھولے نے اپنا گانا ختم کر دیا اور بولا۔

''بابا...آج ماموں جی آئیں گے نہ؟''

''پھر کیا ہوگا بھولے...؟'' میں نے پوچھا۔

''ماموں جی اگن بوٹ لائیں گے۔ ماموں جی کلو (کتا) لائیں گے۔ ماموں جی کے سر پر مکی کے بھٹوں کا ڈھیر ہوگا نہ بابا... ہمارے یہاں تو مکی ہوتی ہی نہیں بابا۔ اور تو اور...ایسی مٹھائی لائیں گے جو آپ نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔''

میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ کس خوبی سے ''خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی'' کے الفاظ سات شہزادوں اور سات شہزادیوں والی کہانی کے بیان میں سے اس نے یاد رکھے تھے۔ ''جیتا رہے'' میں نے دعا دیتے ہوئے کہا۔ ''بہت ذہین لڑکا ہوگا اور ہمارے نام کو روشن کرے گا۔''

شام ہوتے ہی بھولا دروازے میں جا بیٹھا تا کہ ماموں جی کی شکل دیکھتے ہی اندر کی طرف دوڑے اور پہلے پہل اپنی ماتا جی کو اور پھر مجھے اپنے ماموں جی کے آنے کی خبر سنائے۔

دیوں کو دیا سلائی دکھائی گئی۔ جوں جوں رات کا اندھیرا گہرا ہوتا جاتا دیوں

کی روشنی زیادہ ہوتی جاتی۔ متفکرانہ لہجے میں مایا نے کہا۔

''باباجی۔ بھیا ابھی تک نہیں آئے۔''

''کسی کام کی وجہ سے ٹھہر گئے ہوں گے۔''

''ممکن ہے کوئی ضروری کام آپڑا ہو...راکھی کے روپئے ڈاک میں بھیج دیں گے...''

''مگر راکھی؟''

''ہاں راکھی کی کہو۔ انھیں اب تک تو آجانا چاہیے تھا۔''

میں نے بھولے کو زبردستی دروازے کی دہلیز پر سے اٹھایا۔ بھولے نے اپنی ماتا سے بھی زیادہ متفکرانہ لہجے میں کہا: ''ماتاجی۔ ماموں جی کیوں نہیں آئے؟''

مایا نے بھولے کو گود میں اٹھاتے ہوئے اور پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید صبح کو آجائیں تیرے ماموں جی۔ میرے بھولے۔''

پھر بھولے نے اپنے نرم و نازک بازوؤں کو اپنی ماں کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا:

''میرے ماموں جی تمھارے کیا ہوتے ہیں؟''

''جو تم ننھی کے ہو۔''

''بھائی؟''

''تم جانو۔''

''اور بنسی (بھولے کا دوست) کے کیا ہوتے ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

''بھائی بھی نہیں؟''

''نہیں ...''

اور بھولا اس عجیب بات کو سوچتا ہوا سو گیا۔ جب میں اپنے بستر پر لیٹا تو پھر وہ مشعل کی مانند چمکتا ہوا ستارہ آسمان کے ایک کونے میں میرے گھورنے کی وجہ سے ماند ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے پھر بھولے کا چہرہ یاد آ گیا جو میرے خانقاہ والے کنوئیں کو جانے پر تیار ہونے کی وجہ سے یوں ہی ماند پڑ گیا تھا۔ کتنا شوق ہے بھولے کو کہانیاں سننے کا۔ وہ اپنی ماں کو استوتر بھی پڑھنے نہیں دیتا۔ اتنا سا بچہ بھلا گیتا کو کیا سمجھے۔ مگر صرف اس وجہ سے کہ اس کے ادھیائے کا مہاتم ایک دلچسپ کہانی ہوتا ہے۔ وہ نہایت صبر سے ادھیائے کے ختم ہونے اور مہاتم کے شروع ہونے کا انتظار کیا کرتا ہے۔

''مایا کا بھائی ابھی تک نہیں آیا۔ شاید نہ آئے۔'' میں نے دل میں کہا۔ ''اسے اپنی بہن کا پیار سے جمع کیا ہوا مکھن کھانے کے لیے تو آ جانا چاہیے تھا۔'' میں ستاروں کی طرف دیکھتے دیکھتے اونگھنے لگا۔ یکا یک مایا کی آواز سے میری نیند کھلی۔ وہ دودھ کا کٹورا لیے کھڑی تھی۔

''میں نے کئی بار کہا ہے۔ تم میرے لیے اتنی تکلیف نہ کیا کرو۔'' میں نے کہا۔

دودھ پینے کے بعد فرط شفقت سے میرے آنسو نکل آئے۔ حد سے زیادہ خوش ہو کر میں مایا کو یہی دعا دے سکتا تھا نا کہ وہ سہاگ وتی رہے۔ کچھ ایسا ہی میں نے کہنا چاہا۔ مگر اس خیال کے آنے سے کہ اس کا سہاگ تو برس ہوئے لٹ گیا تھا۔ میں نے کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے اپنی رقت کو دباتے ہوئے کہا۔

''بیٹی... تمھیں اس سیوا کا پھل ملے بغیر نہ رہے گا۔''

پھر میرے پہلو میں بچھی ہوئی چارپائی پر سے بھولا ننھی کو جو کہ اس کے ساتھ

ہی سو رہی تھی، پرے دھکیلتے ہوئے اور آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا۔ اٹھتے ہی اس نے کہا۔

''بابا۔ ماموں جی ابھی تک کیوں نہیں آئے؟''

''آ جائیں گے... بیٹا، سو جاؤ، وہ صبح سویرے آ جائیں گے۔''

اپنے بیٹے کو اپنے ماموں کے لیے اس قدر بیتاب دیکھ کر مایا بھی کچھ بیتاب سی ہو گئی۔ عین اسی طرح جس طرح ایک شمع سے دوسری شمع روشن ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد بھولے کو لٹا کر تھپکنے لگی۔

مایا کی آنکھوں میں بھی نیند آنے لگی۔ یوں بھی جوانی میں نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور پھر دن بھر کام کاج کر کے تھک جانے کی وجہ سے مایا گہری نیند سوتی تھی۔ میری نیند تو عام بوڑھوں کی نیند تھی۔ کبھی ایک آدھ گھنٹے تک سو لیتا۔ پھر دو گھنٹے جاگتا رہتا۔ پھر کچھ دیر اونگھنے لگ جاتا اور باقی رات اختر شماری کرتے گذار دیتا۔ میں نے مایا کو سو جانے کے لیے کہا اور بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا۔

''بتی جلتی رہنے دو۔ صرف دھیمی کر دو... میلے کی وجہ سے بہت سے چور چکار ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔'' میں نے سوتی ہوئی مایا سے کہا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس دفعہ میلے پر جو لوگ آئے تھے ان میں ایسے آدمی بھی تھے جو کہ ننھے ننھے بچوں کو اغوا کر کے لے جاتے تھے۔ پڑوس کے ایک گاؤں میں دو ایک ایسی وارداتیں ہوئی تھیں اور اسی لیے میں نے بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا تھا۔ میں نے دیکھا بھولا جاگ رہا تھا۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو میں نے بتی کو دیوار پر نہ دیکھا۔ گھبرا کر ہاتھ پسارا تو میں نے دیکھا کہ بھولا بھی بستر پر نہ تھا۔ میں نے اندھوں کی طرح

درودیوار سے ٹکراتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے تمام چارپائیوں پر دیکھا۔ مایا کو بھی جگایا۔ گھر کا کونا کونا چھانا۔ بھولا کہیں نہ تھا۔

''مایا!... ہم لٹ گئے۔'' میں نے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا۔

مایا ماں تھی۔ اس کا کلیجہ جس طرح شق ہوا یہ کوئی اسی سے پوچھے۔ اپنے سہاگ لٹنے پر اس نے اتنے بال نہ نوچے تھے جتنے کہ اس وقت نوچے۔ اس کا دل بیٹھا جارہا تھا اور وہ دیوانوں کی طرح چیخیں ماررہی تھی۔ پاس پڑوس کی عورتیں شور سن کر جمع ہوگئیں اور بھولے کی گمشدگی کی خبر سن کے رونے پیٹنے لگیں۔

میں عورتوں سے زیادہ پیٹ رہا تھا۔ آج میں نے ایک بازی گر کو اپنے گھر کے اندر گھورتے بھی دیکھا تھا۔ مگر میں نے پروا نہیں کی تھی۔ آہ! وہ وقت کہاں سے ہاتھ آئے۔ میں نے دعائیں کیں کہ کسی وقت کا دیا کام آجائے۔ منتیں مانیں کہ بھولا مل جائے۔ وہی گھر بھر کا اجالا تھا۔ اسی کے دم سے میں اور مایا جیتے تھے۔ اسی کی آس سے ہم اڑے پھرتے تھے۔ وہی ہماری آنکھوں کی بینائی، وہی ہمارے جسم کی توانائی تھا۔ اس کے بغیر ہم کچھ نہ تھے۔

میں نے گھوم کر دیکھا، مایا بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس کے ہاتھ اندر کی طرف مڑ گئے تھے۔ نسیں کھنچی ہوئیں اور آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور عورتیں اس کی ناک بند کر کے ایک چمچے سے اس کے دانت کھولنے کی کوشش کررہی تھیں۔

میں سچ کہتا ہوں ایک لمحے کے لیے میں بھولے کو بھی بھول گیا۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک ساتھ گھر کے دو بشر جب دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے چلے جائیں تو اس وقت دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے لرزتے ہوئے ایشور کو برا بھلا کہا کہ ان دکھوں کے دیکھنے سے پیشتر اس نے میری ہی جان کیوں نہ لے لی۔

آہ! مگر جس کی قضا آتی ہے اس کے سوا کسی اور کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔

قریب تھا کہ میں بھی مایا کی طرح گر پڑوں کہ مایا ہوش میں آ گئی۔ مجھے پہلے سے کچھ سہارا ملا۔ میں نے دل میں کہا۔ میں ہی مایا کو سہارا دے سکتا ہوں۔ اور اگر میں خود اس طرح حوصلہ چھوڑ دوں تو مایا کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ میں نے حواس جمع کرتے ہوئے کہا۔

''مایا بیٹی! دیکھو! مجھے یوں خانہ خراب مت کرو... حوصلہ کرو۔ بچے اغوا ہوتے ہیں مگر آخر مل بھی جاتے ہیں۔ بازی گر بچوں کو مارنے کے لیے نہیں لے جاتے۔ پال کر بڑا کر کے کسی کام میں لانے کے لیے لے جاتے ہیں۔ بھولا مل جائے گا۔''

ماں کے لیے یہ الفاظ بے معنی تھے۔ مجھے بھی اپنے اس طرح صبر کرنے پر گمان ہوا۔ گویا میں اس وجہ سے چپ ہو گیا کہ مایا کے مقابلے میں بھولے سے بہت کم پیار ہے۔ مگر ''نہیں''، میں نے کہا، ''مرد کو ضرور کچھ حوصلہ دکھانا چاہیے۔''

اس وقت آدھی رات ادھر تھی اور آدھی رات ادھر جب ہمارا پڑوسی اس حادثے کی خبر تھانے میں پہنچانے کے لیے، جو گاؤں سے دس کوس دور شہر میں تھا، روانہ ہوا۔

باقی ہم سب ہاتھ ملتے ہوئے صبح کا انتظار کرنے لگے۔ تا کہ دن نکلنے پر کچھ سجھائی دے۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور ہم نے بھولے کے ماموں کو اندر آتے دیکھا اس کی گود میں بھولا تھا۔ اس کے سر پر مٹھائی کی ٹوکریاں اور ایک ہاتھ میں بتی تھی۔ ہمیں تو گویا تمام دنیا کی دولت مل گئی۔ مایا نے بھائی کو پانی پوچھا نہ خیریت اور اس کی گود سے بھولے کو چھین کر اسے چومنے لگی۔ تمام اڑوس پڑوس نے مبارکباد دی۔ بھولے کے

ماموں نے کہا۔

"مجھے کسی کام کی وجہ سے دیر ہوگئی تھی۔ دیر سے روانہ ہونے پر رات کے اندھیرے میں اپنا راستہ گم کر بیٹھا تھا۔ یکا یک مجھے ایک طرف سے روشنی آتی دکھائی دی۔ میں اس کی جانب بڑھا۔ اس خوف ناک تاریکی میں پرس پور سے آنے والی سڑک پر بھولے کو بتی پکڑے ہوئے اور کانٹوں میں الجھے ہوئے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ میں نے اس وقت اس کے وہاں ہونے کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا... کہ بابا جی نے آج دوپہر کے وقت مجھے کہانی سنائی تھی اور کہا تھا کہ دن کے وقت کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ تم دیر تک نہ آئے تو میں نے یہی جانا کہ تم راستہ بھول گئے ہو گے اور بابا نے کہا تھا کہ اگر کوئی مسافر راستہ بھول گیا تو تم ذمہ دار ہو گے نہ!!"

غور کرنے کی بات

راجندر سنگھ بیدی (1915 تا 1984) بھی کرشن چندر کی طرح اردو کے ممتاز ترین افسانہ نگاروں میں ہیں۔ بیدی بھی ترقی پسند خیالات سے متاثر تھے، لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے اپنی راہ الگ نکالی۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں کے برخلاف دنیا انھیں پیچیدہ نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں زندگی غریب امیر، حاکم محکوم، اچھے برے کا سادہ کھیل نہیں ہے۔ اس میں بہت سی پیچیدگیاں اور بہت سی انجانی راہیں اور چیزیں بھی ہیں۔ بیدی کی زبان میں بھی کرشن چندر جیسی سادگی نہیں ہے۔ وہ عام راستے سے ہٹ کر الفاظ استعمال کرتے ہیں اور عام باتوں میں نئے پہلو نکال لیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اس افسانے میں دیکھتے ہیں، ننھے بچے بھولا کو کہانیوں کی قوت پر پورا یقین ہے، اور اس بات کو بالکل سچ سمجھتا ہے کہ کہانیوں میں واقعی اتنی طاقت ہے کہ اگر وہ دن میں سنائی جائیں تو مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ ہماری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ اگر دن میں کہانی سنائی جائے تو سننے والے کا ماموں راستہ بھول جاتا ہے۔ بیدی نے اس عقیدے کا پنجابی روپ بیان کیا

ہے کہ سننے والے کا ماموں ہی نہیں، کوئی بھی مسافر راستہ بھول سکتا ہے۔ لیکن انھوں نے بھولا کے ماموں کو مسافر بنا کر دونوں باتوں کا لحاظ رکھ لیا ہے۔

بیدی یہ بھی کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ ننھا لڑکا بھولا ہی نہیں، خود افسانہ نگار بھی کہانیوں کی قوت پر یقین رکھتا ہے۔ وہ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ کہانی سنائے جانے کے نتیجے میں خواہ کوئی راستہ نہ بھولے، لیکن ہر کہانی اپنی جگہ سچی پھر بھی ہوتی ہے۔

جیسا کہ ظاہر ہوگا، یہ ایک سکھ خاندان کا افسانہ ہے۔ افسانہ بیان کرنے والے بوڑھے سکھ، یعنی افسانے کے راوی کی بیوہ بہو گیتا پاٹھ میں جن مصرعوں کو دہراتی ہے، قریب قریب بالکل وہی مصرعے مسلمان عورتوں کی بھی ایک مشہور مناجات میں ہیں اور اکثر مسلمان گھروں میں اب بھی پڑھے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں قومی یکجہتی اور مسلم غیر مسلم ملاپ کی اس سے اچھی مثال ملنا مشکل ہے ۔

ہے زیبا تجھے اکبری سروری مری بار کیوں دیر اتنی کری

بیدی لکھتے ہیں، ''بھولے کا جسم بہت نرم تھا''؛ ''بھولے کو اس بات کا علم تھا''، وغیرہ۔ جن لفظوں کے آخر میں الف یا چھوٹی ''ہ'' ہو، ان کے بعد اگر کا/کی/کے/میں/پر، جیسا لفظ آئے تو الف یا چھوٹی ''ہ'' کو جھکا کر بڑی ے کر لیتے ہیں۔ اس عمل کو 'امالہ' (جھکانا) کہا جاتا ہے۔ لوگوں کے ناموں پر امالہ نہیں جاری کیا جاتا، لیکن پنجابی میں لوگوں کے ناموں پر بھی امالہ جاری کر لیتے ہیں۔ بیدی نے اسی لحاظ سے ''بھولا کو'' کے بجائے ''بھولے کو'' لکھا ہے۔

اس افسانے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ بیدی نے بھولا کی معصوم باتوں اور اس کے دادا کی محبت بھری باتوں اور سسر بہو کے آپسی رشتوں کے بیان کے ذریعہ ایک چھوٹے موٹے گھرانے کی پوری تصویر کھینچ دی ہے، اس گھرانے میں کچھ سکھ بھی ہیں اور کچھ دکھ بھی ہیں۔

فرہنگ

استوتر = A hymn; A line of a hymn भजन, भजन की एक पंक्ति ।

روح فرسا=	Soul-searing	दिल को अत्यधिक दुखः पहुंचाने वाला, बहुत आघात पहुंचाने वाला / वाली।
مخمصہ=	Dilemma	उलझन, मुश्किल।
ادھیائے=	Chapter	अध्याय।
مہاتم=	A verse or verses which conclude a chapter of the Gita	गीता के प्रत्येक अध्याय के अन्त में लिखे हुए श्लोक।
مزارع=	Peasant who tills the land of a landlord	वह किसान जो ज़मीनदार के खेत जोतता है।
توقف=	Pause	ठहरना, ठहराव, देर।
جریب=	A chain, 55 yards long, for measurement of land	भुमि नापने की ज़ंज़ीर जो 55 गज़ की होती है।
مکی=	Indian corn	मकई, भुट्टा।
قیدِ بامشقت=	Imprisonment with hard labour	कड़ी मेहनत के साथ कारागार की सज़ा।
معمول=	Usual	दिनचर्या

دیا سلائی دکھانا =	To light with a match stick	दियासलाई के द्वारा प्रकाश फैलाना/करना।
ماند =	Dim	धुंधला।
فرط =	Excess	अधिकता।
رقت =	Weepiness	रूआंसा होना।
شق ہونا =	To crack; To burst	फट जाना
پیٹ رہا تھا =	Was in tears	रो रहा था
خانہ خراب =	One whose house is in ruins	जिसका घर बर्बाद हो जाए।

خطوط غالب

میرزا اسداللہ خان غالب

مراسلہ بنام منشی نبی بخش حقیر

بھائی صاحب کو سلام اور حسن اہتمام شادی کی، اور مع الخیر معاودت کی مبارک باد۔

حضرت، آپ کا بھائی بن کر میں بھی مثل آپ کے عدیم الفرصت بن گیا۔ بیس بائیس دن سے حضور والا دربار کرتے ہیں۔ آٹھ نو بجے جاتا ہوں، بارہ بجے آتا ہوں۔ یا روٹی کھانے میں ظہر کی اذان ہوتی ہے، یا ہاتھ دھوتے میں۔ سب ملازمین کا یہی حال ہے۔ اور کوئی روٹی کھا کر جاتا ہوگا، مجھ سے بعد کھانا کھانے کے چلا نہیں جاتا۔

یہ تو جو کچھ تھا سو تھا۔ پرسوں سے از راہ عنایت حکم دیا ہے کہ شام کو رہتے میں لب دریا پتنگ بازی ہوتی ہے، تو بھی سلیم گڈھ پر آیا کر۔ خلاصہ یہ کہ صبح کو جاتا ہوں، دوپہر کو آتا ہوں۔ کھانا کھا کر پانچ چار گھڑی دم لے کر جاتا ہوں، چراغ جلے آتا ہوں۔ بھائی تمھارے سر کی قسم رات کو مزدوروں کی طرح تھک کر پڑ رہتا ہوں۔ آج چوتھے دن تمھارے خط کا جواب لکھنے کی فرصت پائی ہے۔ سو فرصت کیا، کھانا کھا کر

لیتا نہیں، تم کو خط لکھا۔

روز چار شنبہ، 9 دسمبر 1856، وقت نماز ظہر، اسد

مراسلہ بنام منشی ہر گوپال تفتہ (1)

صاحب، تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ تھا اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت در پیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمھارے دوست دلی تھے، اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔

ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا، اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اس کا جواب مجھ کو آیا۔ اور آج ایک خط تمھارا، کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہر گوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بلّی ماروں کا محلّہ ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں کا نہیں پایا جاتا۔

واللہ، ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا، کیا امیر کیا غریب، کیا اہل حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہندو البتہ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔ اب پوچھو کہ تو کیونکر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا؟ صاحب بندہ، میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرائے پر رہتا ہوں۔ اور یہاں قریب قریب کیا، دیوار بہ دیوار گھر ہیں حکیموں کے، اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجہ نے صاحبان عالیشان سے عہد لے لیا تھا کہ بر وقت غارت دہلی یہ لوگ بچے

رہیں۔ چنانچہ بعد فتح، راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا، ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیر دار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ، کوئی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔

ملازمان قلعہ پر شدت ہے، اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر، دس دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر مقرر ہوا ہوں۔ خواہے اس کو نوکری سمجھو، خواہے مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا، صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیر دار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔

غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک، یعنی شنبہ پنجم دسمبر 1857 تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم، بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی

آبادی کا حکم ہوتا ہے کہ نہیں۔ بہر حال، منشی صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اس وقت تمھارا خط پہنچا، اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دیا۔

مراسلہ بنام حکیم غلام نجف خان

بھائی، ہوش میں آؤ۔ میں نے تم کو خط کب بھیجا اور رقعے میں کب لکھا کہ شیر زماں کا خط تمھارے پاس بھیجتا ہوں؟ میں نے تو ایک لطیفہ لکھا تھا کہ شیر زماں خاں نے میرے خط میں تم کو بندگی لکھی تھی اور میں وہ بندگی اس رقعے میں لپیٹ کر تم کو بھیجتا ہوں۔ بس بات اتنی ہی تھی۔ وہی بندگی، لکھی ہوئی گویا لپیٹی ہوئی تھی، سو حضرت کو پہنچ گئی۔ خاطر عاطر جمع رہے۔

[غالباً1858]　　　　غالب

مراسلہ بنام منشی ہرگوپال تفتہ (2)

میرزا تفتہ، جو کچھ تم نے لکھا، یہ بے دردی ہے اور بدگمانی۔ معاذ اللہ، تم سے اور آزردگی! مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں جس کا ہرگوپال نام اور تخلص تفتہ ہے۔ تم ایسی کون سی بات لکھو گے کہ موجب ملال ہو؟ رہا غماز کا کہنا، اس کا حال یہ ہے کہ میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا کہ وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا۔ مثلاً وہ جیتا ہوتا اور ہوشیار ہوتا اور تمھاری برائی کہتا، تو میں اس سے آزردہ ہوتا اور اس کو جھڑک دیتا۔

بھائی، مجھ میں کچھ اب باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گذر گئی لیکن

بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔تمام دن پڑا رہتا ہوں، بیٹھ نہیں سکتا۔اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔معہٰذا یہ بھی ہے کہ اب مشق تمھاری پختہ ہوگئی۔خاطر میری جمع ہے کہ اصلاح کی حاجت نہ پاؤں گا۔اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ قصائد سب عاشقانہ ہیں، بکار آمدنی نہیں۔خیر کبھی دیکھ لوں گا، جلدی کیا ہے؟

تین بات جمع ہوئیں: میری کاہلی، تمھارے کلام کا محتاج بہ اصلاح نہ ہونا، کسی قصیدے سے کسی طرح کے نفع کا تصور نہ ہونا۔نظران مراتب پر کاغذ پڑے رہے۔

لالہ بالمکند بے صبر کا ایک پارسل ہے کہ اس کو بہت دن ہوئے، آج تک سرنامہ بھی نہیں کھولا۔نواب صاحب کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں۔

ضعف نے غالب نکما کر دیا　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ قصیدہ تمھارا کل آیا۔آج اس وقت کہ سورج بلند نہیں ہوا، اس کو دیکھا، لفافہ کیا۔آدمی کے ہاتھ گھر بھجوایا۔

27 نومبر 1862　　　　غالب

❀❀

غور کرنے کی بات

میرزا (یا مرزا) اسداللہ خان (یا خاں) غالب دہلوی (1797 تا 1869) کی طرح کا شخص اردو ادب میں دوسرا نہیں ہے۔بہت سے لوگ انھیں اردو کا سب سے بڑا شاعر، اور سب سے بڑا نثر نگار نہیں تو سب سے بڑے نثر نگاروں میں سے ایک شمار کرتے ہیں۔پھر یہ بھی ہے کہ وہ فارسی کے بھی بہت بڑے شاعر تھے۔انھوں نے اردو میں مکتوب نویسی کا ایک نہایت دلکش، بے تکلف، بڑی حد تک سادہ، تھوڑا بہت ظرافت آمیز، بات چیت جیسا، لیکن علمی اور ادبی انداز

اختیار کیا اور اس طرح وہ اردو میں نئی طرح کی مکتوب نگاری کے موجد بھی ٹھہرے۔انھوں نے ایک خط میں ٹھیک لکھا ہے کہ میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ان خطوط کی بنا پر، اور ان کی کچھ اور تحریروں کی بنا پر اردو کی ادبی تہذیب اور وسط انیسویں صدی کی دہلوی تہذیب و تاریخ میں بھی ان کی بڑی اہمیت ہے۔جیسا کہ ہم مندرجہ بالا اقتباسات میں دیکھ سکتے ہیں، غالب کے خطوط میں ہمیں اعلیٰ درجے کی نثر کے ساتھ ساتھ ان کے زمانے کی تاریخی اور سماجی زندگی کی بے مثال تصویر ملتی ہے۔

نبی بخش حقیر کے نام خط میں ''حضور والا'' سے بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور ''سلیم گڑھ'' سے وہ قلعہ مراد ہیں جو جمنا کے بیچ میں ایک جزیرے پر سلیم شاہ سوری نے بنوایا تھا۔دسمبر 1856 میں جو امن و امان کی دنیا تھی اس کی مخالف اور دردناک تصویر ٹھیک ایک سال بعد کی دلی میں نظر آتی ہے جب 1857 کی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں کی شکست کے بعد اہل ہند پر اور خاص کر مسلمانوں اور بہادر شاہ کے دربار سے وابستہ تمام لوگوں پر انگریزوں کا قہر برس رہا تھا۔غالب صرف اشاروں میں بات کر رہے ہیں اور لکھتے ہیں کہ پورا حال لکھتے ڈرتا ہوں۔ان کو خوف ہے کہ کہیں ان پر بھی انگریزوں کا عتاب نہ نازل ہو کہ تو یہاں کی مخبری کر رہا ہے۔

غالب نے انگریزوں کو ''صاحبان عالیشان'' لکھا ہے۔یہ اس زمانے کا عام طریقہ تھا۔شروع شروع میں ''کمپنی بہادر''، ''جان کمپنی'' وغیرہ بھی انگریزوں، یا ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے بولتے تھے، لیکن بعد میں جیسے جیسے انگریزوں کا زور بڑھتا گیا ان کے لیے عزت اور توقیر کے لفظ زیادہ بولے جانے لگے۔''صاحبان عالی شان'' ایسا ہی ایک فقرہ تھا۔''بوقت غارت دہلی'' میں یہ نکتہ پنہاں ہے کہ یہ بات تو گویا طے ہی تھی کہ انگریزوں کا قبضہ دہلی پر دوبارہ ہو جائے گا اور اب جو وہ شہر میں داخل ہوں گے تو شہر کو ''غارت'' کریں ہی کریں گے۔''غارت'' سے مراد وہ لوٹ مار، قتل، آتش زنی اور تباہی وغیرہ ہے جو فاتح فوج مفتوح شہر پر روا رکھتی ہے۔لفظ ''غارت'' اب اس طرح نہیں بولا جاتا۔اب ''غارت ہونا/ جانا/ کرنا'' وغیرہ بولتے ہیں۔

غالب نے ''پنشن'' (Pension) کو جگہ جگہ ''پنسن'' لکھا ہے۔اگرچہ آج کل اسے اردو میں بھی ''پنشن'' کہتے ہیں، لیکن اردو میں بعض لفظ انگریزی، فرانسیسی، اور سنسکرت کے ایسے

اب بھی ہیں جن میں شین کی آواز کو سین بولا جاتا ہے، مثلاً:

کارتوس (فرانسیسی میں کارتوش)؛ بھیس (سنسکرت میں ویش)؛ دیس (سنسکرت میں دیش)

'' مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں...'' یہاں لفظ '' مگر'' کے معنی ہیں، '' سوائے''، یعنی ان نوکروں کے سوائے جو اس زمانے میں...'' ہنگام'' کے معنی یہاں '' زمانہ، وقت'' ہے۔ یہ دونوں استعمال اب بھی رائج ہیں۔

اس خط میں غالب یہ بات بھی مان رہے ہیں کہ وہ جنگ کے دنوں میں بھی بادشاہ کے دربار کے ملازم تھے، لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی نوکری شاعری کی تھی، اور کسی جگہ ان کی '' طرف کوئی بات نہیں پائی گئی۔'' یہاں '' طرف'' بمعنی '' خلاف'' ہے۔ اب یہ معنی رائج نہیں ہیں۔ '' سیاست'' کو غالب نے اس کے اصل عربی معنی '' سختی، سزا'' کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ '' سَیِس/سائیس'' کی بھی اصل یہی ہے، یعنی '' تربیت اور سختی کرنے والا۔'' اردو فارسی میں اسے '' گھوڑے کی تربیت کرنے والا، دیکھ بھال کرنے والا'' کے معنی میں بولتے ہیں۔

'' دیوار بہ دیوار گھر ہیں حکیموں کے''، یعنی حکیموں کے گھر ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ '' نظر اپنی بے گناہی پر''، یعنی اپنی بے گناہی کو دیکھتے ہوئے۔ '' خاطر میری جمع ہے''، یعنی میری خاطر جمع ہے۔ پرانے زمانے میں اس طرح کے فقرے فارسی کے اثر سے عام تھے جن میں الفاظ کی ترتیب کو اردو کے قاعدے سے ذرا مختلف بنا کر لکھ دیتے تھے۔ اسی طرح، نہال چند لاہوری کے یہاں ہم دیکھتے ہیں، '' بھلائی کی، نیکی کی امید پر۔'' پرانے زمانے میں فارسی کے محاورے بھی اردو میں ترجمہ کر لیے جاتے تھے۔ '' میری خاطر جمع ہے''، یعنی مجھے اطمینان ہے، بھی ایسا ہی ایک محاورہ ہے۔

'' جرنیلی بندوبست'' وہی ہے جسے آج '' مارشل لا'' (Martial Law) یعنی فوجیوں کے ذریعہ اور فوجی قانون کے تحت انتظام حکومت کہتے ہیں۔ بعد کے لوگوں نے '' جرنیلی بندوبست/ نظام'' جیسا عمدہ فقرہ ترک کر کے سیدھا سیدھا انگریزی فقرہ اختیار کر لیا۔

ہرگوپال تفتہ کے نام دوسرے خط میں غالب انھیں عقل مندی کی بات بتاتے ہیں کہ

تمھارے قصیدے جو تم نے اصلاح کے لیے بھیجے ہیں، وہ کسی کی تعریف میں تو ہیں نہیں کہ ان سے انعام کی امید ہو۔ لہٰذا ان کی اصلاح کی کچھ جلدی نہیں، جب ہو سکے گا اصلاح کر کے بھیج دوں گا۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ قصیدے کے لیے ضروری نہیں کہ کسی کی تعریف میں لکھا جائے۔ قصیدہ عاشقانہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس خط میں غالب کی تھکن اور بڑھاپے اور بیماری کی تصویر چند ہی لفظوں میں آ گئی ہے۔ لیکن ان کے مزاج کی ظرافت ویسی ہی موجود ہے۔ حکیم غلام نجف خاں کے نام خط میں وہ شیر زماں خاں کے سلام کے بارے میں کیسی پر لطف بات کہتے ہیں۔ تفتہ کے نام دوسرے خط میں وہ اپنے بڑھاپے کا بیان اپنے ایک شعر کے ذریعہ لکھتے ہیں لیکن اسے کچھ بدل کر اور کچھ مزاحیہ بنا دیتے ہیں۔ اصل شعر ہے ۔

عشق نے غالب نکما کر دیا　　　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

غالب نے ''عشق'' کو ''ضعف'' کر کے نیا لطف پیدا کر دیا۔

''حقیقی بھائی کل ایک تھا، کہ وہ تیس برس...'' یہاں ''کہ'' کے معنی ہیں: ''اس کی تفصیل یہ ہے۔'' لفظ ''کہ'' کو اس طرح برتا جائے تو اسے ''کاف بیانیہ'' کہتے ہیں، یعنی وہ حرف جو کسی بات کو بیان کرتا ہو۔ یہ خوبی صرف فارسی اور اردو میں ہے۔

''لفافہ کیا''، یعنی لفافے میں رکھا۔ غالب کے زمانے میں سرکاری لفافہ نہیں تھا، لوگ اپنے لفافے خود بناتے تھے اور کبھی کبھی خود خط ہی کو موڑ لپیٹ کر پڑیا جیسا بنا دیتے تھے۔

منشی ہر گوپال تفتہ فارسی کے اچھے شاعر اور غالب کے محبوب شاگرد تھے۔ غالب انھیں ''میرزا تفتہ'' کہتے تھے۔ منشی نبی بخش حقیر اور غالب میں بہت پرانی دوستی تھی۔ غالب ان کی شعر فہمی کے بہت قائل تھے۔ حکیم غلام نجف خان دہلی میں کشمیری حکیموں کے خاندان کے مشہور حکیم تھے۔ تفتہ کے نام دوسرے خط میں ''نواب صاحب'' سے غالب کے مشہور شاگرد یوسف علی خاں ناظم (1816 تا 1865) نواب رامپور مراد ہیں۔

فرہنگ

اتمام = Completion　　　　समाप्त होना, पूरा होना ।

معاودت=	Return	वापसी
عدیم الفرصت=	Having no leisure	जिसके पास ख़ाली समय न हो।
ریتا=	Sand bank	दरिया/ नदी के किनारे बालू/ रेत का मैदान।
گھڑی=	Unit of time measuring 24 minutes	चौबीस मिनट का समय।
بندگی=	Respectful salutation	सविनय सलाम।
عاطر=	Fragrant, noble, gracious	ख़ुश्बूदार, सुवासित लोग, नेक और सज्जन।
مَعاذَاللہ=	God forbid	अल्लाह की पनाह।
صادِقُ الوَلا=	One who is sincere and true in friendship	सच्ची मुहब्बत वाला।
موجب ملال=	Causing distress or unhappiness	दुख देने वाला, कष्टप्रद।
غمّاز=	Back-biter, talebearer	चुग़ली खाने वाला, झूठी शिकायत।
معہٰذا=	Along with this/it	उसके साथ।

قصائد =	Plural of قصیدہ, a long poem of praise or blame, etc.	'क़सीदा' का बहुवचन। ऐसी नज़्म जिसमें किसी की प्रशंसा या निन्दा की गई हो।
مراتب =	Considerations, circumstances, affairs	लिहाज़, मामला/ मामले
سرنامہ =	Address, titles at the beginning of a letter, something written at the very beginning	किसी पत्र का शीर्षक या पता/ किसी पुस्तक या लेख का प्रारम्भिक भाग।
اختلاط =	Familiarity, intimacy, warm attachment	मेल जोल, दोस्ती, आपसी प्रेम।
انبساط =	Cheerfulness, gladness	हृदय में स्फूर्ति, प्रसन्न्ता।
موسوم =	Named, having the name	नाम दिया हुआ, जिस नाम से किसी को पुकारें।
متخلص =	Having تخلص (pen name)	'तख़ल्लुस' रखने वाला। 'तख़ल्लुस' वह नाम है जो शायर अपनी ग़ज़ल या नज़्म में प्रयुक्त करता है।

مسکن=	Place where one lives	रहने की जगह, ठिकाना।
والی=	Ruler, master	स्वामी, मालिक, शासक।
اہل حرفہ=	Artisan, artisans	कारीगर, दस्तकार।
بازپرس=	Investigation with the view of determining accountability	जांच पड़ताल, प्रश्न और छानबीन जिसके फलस्वरूप किसी को दोषी ठहराया जा सके।
داروگیر=	Taking and seizing, therefore tumult, conflict, tyranny	पकड़ना और रखना, अर्थात अत्याचार करना, किसी को परेशानी और मुसीबत में डालना।
زنہار=	By (no) means, certainly (not)	हरगिज़, कदापि।

لوتھ

محمد حمید شاہد

اس کی ٹانگیں کولھوں کے بالشت بھر نیچے سے کاٹ دی گئی تھیں۔

ایک مدت سے اس نے اپنے تلوؤں کے زخم اپنے ہی بیٹے پر ظاہر ہونے نہیں دیے تھے... مگر کچھ عرصے سے زخم رسنے لگے تھے اور چڑھنے والا درد گھٹنوں کی جکڑن بن گیا تھا... حتیٰ کہ درد کی ٹیک اس کے حواس معطل کرنے لگی۔ اسے سمتوں کا شعور نہ رہتا تھا، جدھر جانا ہوتا، ادھر نہ جاتا بلکہ الٹی سمت کو نکل پڑتا۔

اسے بار بار ڈھونڈ کر گھر لایا جاتا۔ ہر بار اس کے زخم رس رہے ہوتے تھے۔

زخم تھے تو بہت پرانے، مگر بیٹے پر ان کے ظاہر ہونے اور اس کے حواس باختہ کر دینے کا واقعہ ایک ساتھ ہوا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ اس کا بیٹا ٹی وی کے سامنے بیٹھا بار بار دکھائے جانے والے وقت کے اعجوبہ سانحہ کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ پہلے ایک طیارہ آیا، قوس بناتا ہوا... اور... ایک فلک بوس عمارت سے ٹکرا گیا۔ شعلے بھڑک اٹھے ...اور ابھی آنکھیں پوری طرح کھل کر حیرت کی وسعت کو سمیٹ رہی تھیں کہ منظر میں ایک اور طیارہ نمودار ہوا۔ پہلے طیارے کی طرح... اور پہلی عمارت کے پہلو میں، اسی کی سی شان سے کھڑی ہوئی دوسری عمارت کے بیچ گھس کر شعلے اچھال گیا۔

وہ اپنے بیٹے کے پیچھے بیٹھا انوکھے اطمینان سے یہ سارا منظر دیکھتا رہا۔ جیسے

یہی کچھ ہونا تھا... یا پھر جیسے یہی کچھ ہونا چاہیئے تھا۔ اگلے روز اطمینان کی جگہ بے کلی نے لے لی... حتیٰ کہ کچھ ہی دنوں میں وہ دہشت زدہ ہو چکا تھا۔

جب پہلی بار ٹی وی اسکرین پر یہ منظر دکھائی دیا تھا تو ایک انوکھی طمانیت کی بھپک کے باعث اس نے اپنے تلووٴں کے زخمی حصے کو سختی سے دبا لیا تھا، جس کے سبب اس کے ہونٹوں سے سسکاری نکل گئی تھی۔ بیٹے نے پلٹ کر باپ کو دیکھا، اور فوری طور پر اس سسکاری کے کچھ اور معنی نکالے... تاہم جب اس کی نظر رِستے تلووٴں پر پڑی تو بہت پریشان ہو گیا۔

بیٹے کو شکایت تھی کہ آخر مجھ سے ان زخموں کو پوشیدہ کیوں رکھا گیا تھا۔

وہ بے حد فکرمندی ظاہر کرنے لگا تھا کہ باپ نے ایسا کیوں کیا؟ بلکہ شاید واقعی فکرمند ہو بھی گیا تھا... تقریباً اتنا ہی فکرمند جتنا کہ دونوں فلک بوس عمارتوں کے ساتھ طیاروں کے ٹکرانے پر ہوا تھا۔

کچھ ہی دن بعد درد میں، تشویش میں، اضافہ ہوتا چلا گیا، حتیٰ کہ دونوں کے حوصلے ٹوٹ گئے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ بیٹے نے مختلف ہسپتالوں کا دورہ کرنے والی ملٹی نیشنل اداروں کے ڈائرکٹروں کی ٹیم سے رابطہ کیا۔ غیر ملکی ڈاکٹروں نے یہاں کے ڈاکٹروں کو سوچ سمجھ کر اپنا اپنا مشورہ دیا اور ان تمام صورتوں پر غور ہونے لگا، جو اس کے باپ کے علاج کے لیے ممکن تھی۔

مگر اس کا باپ تو ان ڈاکٹروں کے نام ہی سے بدکنے لگا تھا۔ اسے نہ جانے کیوں ان کی صورتیں اس کمپنی کے کارپردازوں کی سی لگنے لگی تھیں جنھوں نے اپنے پروجیکٹ ایریا تک بہ سہولت رسائی کے لیے گھر کے سامنے کی پھلواری ایکوائر کروالی

تھی۔اس کے باپ کا خیال تھا کہ اس وقت جوز مین کو زخم لگے تھے، وہ زخم پاؤں کے تلووں نے برداشت کر لیے تھے۔اس کا بیٹا کور آباد کو نکلتی سراب اچھالتی شاہراہ پر لمبی ڈرائیو کرتے ہوئے باپ کی باتوں کے بارے میں سوچتا اور قہقہے مار کر ہنستا تھا۔

وہ قہقہے مار کر ہنستا رہا، حتیٰ کہ قہقہوں کے زور سے اس کی آنکھوں میں نمکین بدمزہ پانی بھر گیا۔

جب اس کا باپ رفتہ رفتہ اپنے حواس کھوتا چلا جا رہا تھا، تب بھی اس کی آنکھوں میں ایسا ہی نمکین بدمزہ پانی بھرا ہوا تھا۔

پہلے پہل یوں ہوا تھا کہ ٹی وی پر دونوں عمارتوں سے جہاز ٹکراتے دیکھ کر اس نے بھی قہقہہ مارا اور قہقہہ مارتا ہی چلا گیا، حتیٰ کہ آنکھیں کڑوے پانی سے بھر گئیں۔ جب اس کی آنکھیں بار بار نشر کیے جانے والے منظر کو دیکھنے کے قابل ہو گئیں تو وہ کچھ عجیب طرح سے سوچنے لگا تھا۔منظر میں تو جہاز جڑواں فلک بوس میناروں کے بیچ میں گھستے تھے مگر اسے یوں لگتا جیسے وہ دونوں مینار لوہے اور سیمنٹ کے نہ تھے، بلکہ اس کی اپنی ہڈیوں اور گوشت کے بنے ہوئے تھے۔

ادھر سے جب بھی شعلے اٹھتے تھے، ادھر اس کو درد کی ٹیس جکڑ لیتی تھی۔ درد بڑھتا گیا، اس قدر... جس قدر کہ وہ بڑھ سکتا تھا۔

جن ڈاکٹروں کے ساتھ بیٹے نے رابطہ کیا تھا، ان سب کا کہنا تھا کہ بہت دیر ہو چکی تھی، ٹانگوں کا کاٹ دیا جانا اس کے باقی بدن کی بقا کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔

اس طرح اس کے باقی بدن کو بچا لیا گیا۔اس بدن کو جس کے زندہ یا مردہ ہونے کے درمیان کچھ زیادہ فاصلہ نہ تھا۔

خود اسے بھی اندازہ نہ ہو سکا کہ آپریشن کے بعد وہ کتنے عرصے تک بے سدھ

پڑا رہا... تاہم اس کے دوران اس کے درد کی شدت کا سلسلہ شاید ہی معطل ہوا ہوگا۔ درد اندر یوں گونجتا تھا کہ باہر کی سمت چھلک مارنے لگتا تھا۔

درد کی کسک جب اس کے ہونٹوں تک پہنچی تو اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے جکڑ لیا... درد کی شدت سے اس کے چہرے کا خلیہ خلیہ تھرانے لگا... حتیٰ کہ اس کے پورے بدن پر لرزہ سا طاری ہوگیا اور یہ وہ آخری لرزہ تھا، جو اس نے اپنے پورے بدن پر بکھر جانے دیا۔ بدن پر لوٹتی تھرتھراہٹ کے سبب اس کے چاروں طرف بھگدڑ سی مچ گئی۔ سب سے زیادہ فکر بیٹے کو لاحق تھی۔ بدن سے باہر چھلکتے ہوئے درد کے باوجود ابھی تک وہ باہر کی دنیا سے بہت دور تھا... وہ تو وہاں تھا جہاں درد کے دھارے کے ساتھ بسین نالے کا پانی تھا۔

اس پانی کے بہاؤ میں شوریدگی تھی۔ اور وہ ساری دہشت بھی تو وہیں تھی جسے پرے دھکیلنے کے وہ عمر بھر جتن کرتا رہا تھا۔

(2)

بسین نالا جہاں وہ رہتا تھا، وہاں سے سات میل ادھر پڑتا تھا۔ اپنے ان دنوں کے دوستوں کے ساتھ وہ اس نالے پر جاتا رہا تھا۔ وہ عمر کے اس مرحلے میں تھا کہ جب بہتے پانی کو دیکھ کر خواہ مخواہ نہانے کو جی کرتا تھا۔ وہ اپنی شلوار نیفے میں اڑس لیا کرتا تھا، بڑے پائینچوں والی بھاری شلوار کو خوب بل دیے جاتے، وہ بسین میں گھس جاتا تو اس وقت تک پانی سے باہر نہ نکلتا تھا جب تک کہ اس کا آخری دوست بھی باہر نہ نکل آتا۔ بسین کا پانی اچھالنا، اس کی ریت پر ننگے پاؤں چلنا اور پانی کے بہاؤ کی مدھم اور مدھری آواز سننا اسے اچھا لگتا تھا۔

وہ اپنے دوستوں سے اس قدر وابستہ ہوتے ہوئے بھی ان جیسا نہ ہو سکا تھا۔

اس کے ساتھی عین اس وقت کہ جب وہاں سے ریل کو گذرنا ہوتا تھا، اسے کھینچ کر ادھر واپس لے جاتے، وہاں جہاں تنگ سے پل کے اوپر سے ریل گذرتی تھی تو تمام ماحول میں ریل کے گذرنے کی گڑگڑاہٹ بھر جاتی تھی۔ ریل گذرنے کے لمحات میں وہ سب پل کے نیچے سے اوپر کا نظارہ کرتے اور قہقہے مارتے تھے... مگر وہ دہشت زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ نکلتا تھا۔ قہقہے مزید بلند ہوتے، وہ ساری قوت مجتمع کر کے قدم اٹھاتا، اتنی بھرپور قوت سے کہ جیسے اس کا اگلا قدم وہاں پڑے گا جہاں نالہ دم توڑ دیتا تھا۔

بعد کے زمانے میں وہ اس چھوٹے سے نالے کی بابت سوچتا تھا تو اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ وہ کوشش اور ہمت سے اس کی یادوں کو حافظے پر پرے دھکیلتا رہا، جب تک وہ حواس میں رہا، اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہا۔ مگر بسین کی اس معصوم اور بے ضرر یاد کو بعد ازاں وقوع پذیر ہونے والے سانحوں نے ثانوی بنا دیا تھا۔ اب تو اس کی یادوں میں بسین کے اندر بپھرے ہوئے پانیوں کا شراٹا بہہ رہا تھا اور وہ ایک ایک منظر پوری جزئیات کے ساتھ آنکھوں کے سامنے گذرتا تھا۔

پہلے پہل دھیرے بہنے والا بسین نالہ، جو بپھر کر دریا بن گیا تھا، وہ پل جس کے نیچے کی چھاجوں برسنے والی دہشت اسے پرے پھینک دیتی تھی، پانیوں کی تندی میں بہہ گیا تھا، اور وہ فاصلہ، جو بچپن میں اپنے دوستوں کے ساتھ پیدل ہی طے کر لیا کرتا تھا، ٹرین پر طے ہوا تھا۔

ٹرین پر اس کے لٹے پٹے مسافروں سے کہیں زیادہ خوف لدا ہوا تھا، دہشت میں گندھا ہوا خوف، چیخیں اور سسکیاں اچھالتا ہوا خوف۔ پل ٹوٹ جانے کے سبب پٹری اکھڑ کر پانیوں کے ساتھ بہہ رہی تھی... اور ریل گاڑی کو کوس بھر پہلے ہی روک لیا

گیا تھا۔

ریل کے رکتے ہی دہشت کا منہ زور ریلا امنڈ پڑا، جو بسین کے کنارے کنارے دور تک پھیل گیا تھا۔ اوپر کہیں شدید بارشیں ہوئی تھیں۔ یہاں بھی مینھ کم نہ برسا تھا اور ابھی تک پھوار سی پڑ رہی تھی مگر اوپر کی بارشوں نے نالے کو دریا بنا دیا تھا۔ لوگوں کے حوصلے تو پہلے کے ٹوٹے ہوئے تھے۔ آگے پل ٹوٹ گیا تھا اور بلوائی کسی بھی وقت ان تک پہنچ سکتے تھے۔ بسین کا بپھرا ہوا پانی سامنے تھا، بلوائی نہیں پہنچے تھے مگر ان کی دہشت پہنچ گئی تھی۔

خوف کے مارے سینوں سے سسکاریاں اچھل رہی تھیں۔ یہ سسکاریاں بسین کے پانی کے شور پر حاوی ہو رہی تھیں۔ وہاں کچھ ہمت والے بھی تھے جو خوف کو پرے دھکیلتے دھکیلتے اکتا گئے تھے۔ اب انھیں ان کے حوصلے اکساتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے بپھرے ہوئے پانیوں میں اپنے قدم ڈال دیے۔ وہ کئی بار اوپر چڑھ گئے تو اسے بھی یقین سا ہونے لگا کہ وہ بھی پار نکل جائے گا۔ اس نے اپنی بیوی کا ہاتھ تھاما، ننھی بیٹی کو کندھے سے لگایا اور ہمت والوں کے ساتھ ہولیا۔ اس نے بیوی کو نگاہ سامنے جمائے رکھنے کی تلقین کی اور خود بھی پار دیکھ کر آگے بڑھنے لگا۔

اس کی بیوی کو آٹھواں آدھے میں تھا۔ پانی دیکھ کر اسے چکر آنے لگے تھے، ایک قدم آگے بڑھاتی تھی تو دو پیچھے کو پڑتے تھے۔ وہ سامنے کنارہ دیکھتی تھی مگر اچھلتا منہ زور پانی اس کا دھیان جکڑ لیتا تھا حتیٰ کہ وہ چکرا گئی، پاؤں اچٹ گئے اور وہ پانی پر لہرانے لگی۔

اس نے بیوی کو چکرا کر پانی پر گرتے ہوئے دیکھا تو اسے سنبھالنے کو لپکا۔ ننھی بیٹی جو کندھے سے لگی تھی، اس پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ بیوی کو سنبھالتے

سنبھالتے بیٹی کو پانی نے نگل لیا۔ اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر وہ چند ہی لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

وہ عین بسین کے وسط سے دکھ سمیٹ کر واپس پہلے کنارے پر پلٹ گئے۔ وہیں انھیں رات ہوگئی، اسی کنارے پر قافلے کی عورتوں نے رات کے کسی وقت اپنی اپنی اوڑھنیوں سے اوٹ بنائی اور سسکیوں کے بیچ ایک معصوم کی ننھی چیخوں کا استقبال کیا۔

یہ وہی معصوم تھا جو اب اتنا بڑا ہوگیا تھا کہ اس نے خود ہی باپ کی ٹانگیں کٹوانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ بیٹا ڈاکٹروں سے پوری طرح متفق ہوگیا تھا کہ پاؤں کا گھاؤ پھیلتے پھیلتے اوپر تک پہنچ چکا تھا لیکن باپ تھا کہ چلنے سے باز نہ آتا تھا... اس طرح بقول ان کے زخم تازہ ہوجاتا تھا۔ اس زخم سے اٹھنے والا سرسراہٹ جیسا مسلسل درد اس کے نچلے دھڑ میں اتنا شدید ہوجاتا کہ اس کی چیخیں نکلتی رہتیں۔ اتنی بلند اور اتنے تسلسل کے ساتھ کہ پڑوسیوں کے بھی کان بجنے لگتے۔

ڈاکٹر کہتے تھے کہ زخم کے اندر زہر پڑ گیا تھا، لہٰذا آپریشن ضروری تھا۔ بیٹا بھی قائل ہوگیا تھا اور اس نے باپ سے رائے لینا مناسب نہیں سمجھا اور وہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کا باپ کوئی معقول رائے دینے کے اہل نہیں رہا تھا۔ بیٹے کو یقین تھا کہ میں ساری صورت حال کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہوں۔ لہٰذا وہ ڈاکٹروں سے متفق ہوگیا۔ آپریشن خاصا طویل تھا۔ آپریشن ہوگیا تو ڈاکٹروں نے حسب عادت اسے تسلی دیتے ہوئے کہا، آپ کا باپ بہت جلد ٹھیک ہوجائے گا...

مگر جب باپ کو ہوش آیا تو وہ اپنے ہی بیٹے سے ایک اور گھاؤ پوری طرح چھپا لینے کے جتن کر رہا تھا۔

یہ اس کے دل کا گھاؤ تھا۔

ایسا زخم جس کے اندر سے درد کا عجب غراٹا اٹھتا تھا۔

وہ غراٹا جس نے بدن کو تھرانے کے بجائے اسے ایک لوتھ بنا دیا تھا۔

(باز گوئی: سید ارشاد حیدر)

❋❋

غور کرنے کی بات

محمد حمید شاہد (پیدائش 1957) پاکستان کے نئے افسانہ نگاروں میں بہت مشہور ہیں۔ ان کے افسانوں میں موجودہ زمانے کے انسانوں کی پریشانیاں اور مسائل اکثر اس طرح بیان ہوتے ہیں کہ ہم نہ صرف یہ کہ اپنے زمانے کی باتوں اور مسائل سے واقف ہو جاتے ہیں بلکہ یہ بھی کہ ان کے ہر افسانے میں کئی اور باتیں ہمارے سوچنے کے لیے ہوتی ہیں۔ ہم نے ان کے اس افسانے کو تھوڑا بہت چھوٹا کر دیا ہے اور اس کی زبان آسان کر دی ہے۔

پہلی بات تو یہ غور کرنے کی ہے کہ افسانہ نگار نے جگہ جگہ انگریزی کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ہم نے دیکھا تھا کہ پریم چند نے بھی ایسا ہی کیا ہے، لیکن ہم نے یہ بھی دیکھا کہ پریم چند کے استعمال کیے ہوئے بہت سے انگریزی الفاظ کی جگہ اب اردو الفاظ رائج ہو گئے ہیں۔ لیکن محمد حمید شاہد کے یہاں ایسا نہیں ہے۔ ان کے کچھ انگریزی الفاظ ایسے ہیں جو اب اردو میں پوری طرح کھپ گئے ہیں، جیسے: ٹی وی، اسکرین، ملٹی نیشنل، ٹیم، ڈاکٹر۔ لہٰذا ان کے لیے کوئی اردو لفظ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن ہم یہاں کچھ لفظ ایسے بھی دیکھتے ہیں جو ابھی اردو میں کھپے نہیں ہیں جیسے پراجکٹ ایریا، ایکوائر، چینل۔ لہٰذا یا تو ان کے لیے اردو کے الفاظ بنانے پڑیں گے یا پھر آہستہ آہستہ یہی لفظ اردو میں رائج ہو کر زبان کا حصہ بن جائیں گے۔ محمد حمید شاہد کا یہ افسانہ ہمارے لیے اس لیے بھی دلچسپ ہے کہ اس میں زبان کی بدلتی ہوئی صورت حال کی طرف اشارے نظر آتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ بعض معمولی انگریزی لفظوں کے اردو لفظ بنا بھی لیے گئے ہیں اور مصنف نے انھیں استعمال بھی کیا ہے۔ ''خلیہ'' انگریزی عام لفظ Cell کا نہایت عمدہ ترجمہ ہے اور اب بالکل رائج ہے۔

افسانہ نگار نے اس چھوٹے سے افسانے میں دو افسانے کھپا دیے ہیں ایک تو نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے دونوں بے حد بلند میناروں کی تباہی، جن کو کچھ لوگوں نے اپنے ہوائی جہاز ٹکرا کر تباہ کر دیا تھا (11 ستمبر 2001) اور دوسرا افسانہ غالباً 1947 کے زمانے کا ہے جب ملک کی تقسیم کے نتیجے میں سرحد کے دونوں طرف سے لوگ بھاگ رہے تھے اور ان پر غیر معمولی ظلم، قتل اور اس سے بھی زیادہ تباہی روا رکھی گئی تھی۔ افسانہ نگار ہم سے یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں واقعات الگ الگ سہی، لیکن دونوں ہی انسانیت سوز واقعات ہیں اور انسان جہاں کا بھی ہو اس کا درد ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ افسانے میں بوڑھا شخص جس کے پاؤں میں تکلیف ہے وہ انسانی درد کا مریض ہے اور ڈاکٹر اس کا علاج نہیں کر سکتے یہاں تک کہ اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئیں تو بھی اس کا درد اس کے دل میں باقی رہا۔

بعض اور الفاظ آپ کے غور کے لیے ہیں۔ مثلاً ''طمانیت'' جو اردو میں ہر جگہ رائج ہے، اصل عربی میں ''طمانینت'' ہے۔ اب اگر کوئی ''طمانینت'' لکھے گا تو اردو کے خلاف لکھے گا، عربی میں چاہے وہی صحیح کیوں نہ ہو۔ ''دھکیلنا'' اور ''ڈھکیلنا'' دونوں صحیح ہے۔ پنجاب اور دہلی میں ''دھکیلنا'' زیادہ رائج ہے۔

افسانہ نگار نے بہت سے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن کی آواز ان کے معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے مثلاً ''سسکاری''، ''تھرتھراہٹ''، ''گڑگڑاہٹ''، ''سّراٹا''، ''سرسراہٹ''، ''غراٹا''۔

فرہنگ

اُعجوبہ	= A wonderful thing	आश्चर्यजनक बात, चीज़, अजूबा।

طیارہ=	Aeroplane	विमान, हवाई जहाज़
قوس=	Arc of a circle; curve of an arch	वृत्त का एक भाग, कमान, धनुष।
فلک بوس=	Sky-high	आकाश छूने वाला, बहुत ऊंचा।
طمانیت=	Composure; Calm; Tranquility	संतोष, शन्ति।
ملٹی نیشنل=	Business company operating in many countries	ऐसी व्यापारिक संस्था जिसकी शाखाएें बहुत से देशों में हों।
پراجکٹ=	Plan for an undertaking; A proposal to do or make something	किसी बड़े काम को करने की योजना, कोई बड़ा काम, विशेषतः रचनात्मक कार्य।
ایریا=	Surface measure	क्षेत्रफल
ایکوائر کرنا=	To gain at low price by the power given by law to the acquiring person	किसी चीज़, विशेषतः भूमि या इमारत को क़ानून की मदद से कम मूल्य पर प्राप्त करना।
سَراب=	Mirage	मरीचिका, मृगतृष्णा।
شوریدگی=	Derangement	मानसिक तनाव अव्यवस्था, परेशानी।

شراٹا	= Echo; Noise; Sound	गूंज, बहुत तेज़ नियमित आवाज़।
جزئیات	= Particulars; Details	भाग, छोटी–छोटी बातें, विस्तृत वर्णन।
پینل	= List of the names of persons to serve on a committee or body	ऐसी सूची जिसमें किसी कार्य विशेष के करने वालों के नाम शामिल हों।
لوتھ	= Dead body; Here, used for a body that is unable to move	शव। यहां ऐसे बदन के अर्थ में आया है जो स्वतः हिल जुल न सके।
خلیہ	= Cell	कोशिका।

Books for Urdu Diploma Course

English Medium

- Urdu for All
  An Introduction to Urdu Script
- Ibtedai Urdu
- Intekhab-e-Nasr-e-Urdu
- Aasan Urdu Shairi

Hindi Medium

- उर्दू सबके लिए
  उर्दू लिपि से परिचय
- इब्तिदाई उर्दू
- इन्तेख़ाब–ए–नस्र–ए–उर्दू
- आसान उर्दू शाईरी

क़ौमी काउंसिल बराए फ़रोग़–ए–उर्दू ज़बान
قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

National Council for Promotion of Urdu Language
(Ministry of HRD, Department of Higher Education, Govt. of India)
West Block-1, Wing No.6, R.K. Puram, New Delhi - 110066

ISBN: 978-81-7587-259-2